مولانا سیّد مناظر احسن گیلانی

(شخصیت اور سوانح)

ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہاں پوری

خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

مولانا سید مناظر احسن گیلانی

(شخصیت اور سوانح)

ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہاں پوری

خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

Maulana Syed Manazir Ahsan Gilani
Shakhsiyat Aur Sawaneh

By
Dr. Abu Salman Shahjahanpuri

Khuda Bakhsh Oriental Public Library
Patna

اشاعت : ۲۰۰۲ء
قیمت : -/۶۰ روپے
غیر ممالک کے لیے: ۳ ڈالر

تقسیم کار:

* کتب خانہ انجمن ترقی اردو
اردو بازار، جامع مسجد، دہلی

* ہورایزن ڈسٹری بیوٹر
۱۴-بی- گوراچند روڈ
پوسٹ: انٹیلی، کلکتہ- ۷۰۰۰۱۴

طابع وناشر: خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ-۴

حرفِ آغاز

ہندوستان کے صوبۂ بہار کے مرکزی شہر پٹنہ کے جوار میں ایک چھوٹا لیکن قدیم اور مردم خیز قریہ گیلانی ہے (جو اب ضلع نالندہ کے تحت ہے)۔ اس سرزمین سے بہت سی نامور ہستیاں پیدا ہوئیں جنھوں نے ملک گیر شہرت حاصل کی۔ یہیں حسنی وحسینی سادات کا ایک خاندان بھی کئی صدیوں سے آباد چلا آرہا ہے۔ اس کے مورث اعلیٰ سید احمد جاجنیری تھے جو اصلاً مدینہ منورہ کے باشندے تھے لیکن ترک سکونت کر کے بغداد چلے آئے تھے اور اس کے محلہ جاجنیر میں فروکش ہوگئے تھے۔ اسی نسبت سے جاجنیری مشہور ہوئے۔ لیکن یہ یہاں زیادہ عرصہ قیام نہ کرسکے اور حالات سے مجبور ہوکر ہندوستان چلے آئے اور خطۂ بہار کا رُخ کیا۔ یہاں ضلع مونگیر میں حاکم وقت نے انہیں جاگیر عطا کی اور اس طرح مستقل قیام کی سبیل پیدا کردی۔ یہ بڑے متقی اور پرہیزگار بزرگ تھے۔ اسی کی برکت سے ان کی اولاد میں بھی زیادہ تر افراد زیور علم سے آراستہ اور دین حنیف کے شیدائی اور مبلغ ہوئے۔ اسی خانوادہ کے چشم و چراغ اور مطلع بہار سے طلوع ہونے والے انتہائی روشن اور درخشندہ ستارے مولانا مناظر احسن تھے جنھوں نے اپنے وطن گیلانی کو اپنے نام کے ساتھ ایسا چسپاں کیا کہ بالآخر وہ ان کے نام کا جزو لاینفک بن گیا۔ مولانا کی ابتدائی تعلیم و تربیت تو حسب روایت خاندان کے بزرگوں کی زیرنگرانی ہوئی۔ اس کے بعد آپ کو ٹونک (راجستھان) بھیج دیا گیا جہاں نامور عالم اور دبستان خیرآباد کی مقتدر شخصیت مولانا سید برکات احمد سے آپ کو خصوصی شرف تلمذ حاصل ہوا۔ بعدازاں آپ ایشیا کی عظیم ترین دینی درسگاہ دارالعلوم دیوبند تشریف لے گئے جہاں آپ نے تحصیل علم کے انتہائی مدارج طے کئے۔ یہاں آپ نے شیخ الہند مولانا محمود حسن، مولانا شبیر احمد عثمانی اور مولانا انورشاہ کشمیری جیسے جید علماء اور نابغۂ روزگار شخصیات سے علمی و روحانی فیضان حاصل کیا۔ ان ارواح قدس کے علاوہ آپ نے شیخ العرب والعجم شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ سے بھی خصوصی طور پر کسب فیض کیا۔ یہ ان حضرات کی تعلیم و تربیت اور حسن صحبت کا فیضان تھا کہ خود آپ کی شخصیت جامع الکمالات اور منبع فیوض و برکات بن گئی۔

مولانا کی عملی زندگی کا زیادہ تر وقت درس و تدریس میں گزرا۔ وہ ایک عرصہ تک جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد (دکن) کے شعبۂ دینیات سے وابستہ رہے اور یہیں سے ۱۹۴۹ء میں پروفیسر و صدر شعبۂ کی حیثیت سے حسن کارکردگی پر وظیفہ یاب ہوئے۔ اس کے بعد اپنے وطن گیلانی تشریف لے آئے اور یہیں ۵/جون ۱۹۵۶ء کو داعیِ اجل کو لبیک کہا۔

مولانا گیلانی کو تصنیف و تالیف سے بھی خصوصی شغف تھا۔ وہ صاحب اسلوب نثر نگار اور بہترین انشاپرداز تھے۔ ان کے قلم میں بڑی شگفتگی تھی۔ انہوں نے متعدد اہم تصانیف اور سیکڑوں مضامین بطور یادگار چھوڑے۔ ان کی تصانیف میں النبی الخاتم، امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی، سوانح قاسمی (تین جلدیں)، تدوین حدیث، الدین القیم، اور مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت کو بے حد قبول عام نصیب ہوا۔

افسوس اس بات کا ہے کہ مولانا کی وفات کے بعد لوگوں نے انہیں بہت جلد فراموش کردیا۔ اس عبقری، جامع الصفات، کثیر الابعاد اور ہمہ جہت شخصیت پر کوئی مبسوط سوانحی یا تحقیقی کام ایسا نہیں ہوا ہے جسے ہم اپنے وقت کے اس فرد فرید کے شایان شان کہہ سکیں۔ مقام شکر ہے کہ ہمارے عہد کے مشہور اہل قلم اور سوانح نگار ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری (مقیم حال کراچی) نے اس جانب توجہ فرمائی اور مولانا کی سیرت و شخصیت اور تدریسی و تصنیفی کارناموں کو اجاگر کرنے کی غرض سے یہ مختصر، لیکن جامع و مفید رسالہ تالیف فرمایا اور اس کے ذریعہ مولانا پر مزید تحقیقی و تصنیفی کام کی راہ ہموار کی۔ ہم ڈاکٹر صاحب کے ممنون ہیں کہ اس وقیع تالیف کی اشاعت کے لیے انہوں نے خدابخش لائبریری کو منتخب فرمایا۔ ہمیں توقع ہے کہ لائبریری کی دیگر مطبوعات کی طرح اسے بھی حسن قبول نصیب ہوگا۔

محمد ضیاء الدین انصاری

ڈائرکٹر

فہرست

مولانا سید مناظر احسن گیلانی

شخصیت اور سوانح

ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پوری

اسلام سر تا سر امید ہے۔ وہ جب کبھی انسان کا ہاتھ پکڑتا ہے تو پہلی چیز جو اسے دیتا ہے، وہ امید ہی ہے۔ اسلام کی اصطلاح میں ایمان امید کا نام ہے اور مایوسی کفر کا مبدا ہے۔

ابوالکلام آزاد

پیش لفظ

دورِ حاضر کے علمائے کرام میں مولانا سید مناظر احسن گیلانی مرحوم علم و تہذیب کی ایک خاص شان کے بزرگ تھے۔ ان کے ذوق علمی کی تربیت میں خانوادہ خیر آباد کے بزرگوں کے نامور اخلاف ــــ سید العلماء مولانا حکیم برکات احمد ٹونکی رحمہ اللہ اور ان کے شاگرد رشید علامہ معین الدین اجمیری نور اللہ مرقدہ نے اور دینی ذوق کی تربیت میں بزرگانِ دیوبند کے اخلافِ سعید شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی اور ان کے نامور شاگرد علامہ محمد انور شاہ کشمیری نے خاص حصہ لیا تھا۔ اس طرح وہ دو خانوادہ ہائے علم و دین کے تربیت و فیض یافتہ، ان کے خصائص کے جامع اور مجمع البحرین کی مثال بن گئے تھے۔ ان کی زندگی اور علمی کاموں میں آخر تک دونوں خانوادوں کے امتیازات کی جھلک صاف نظر آتی تھی اور خصائص کو محسوس کرلیا جاسکتا تھا۔ علم و دین کے یہ دونوں خانوادے اس کے بعد بھی قائم رہے اور ان سے بڑی بڑی شخصیتیں پیدا ہوئیں لیکن حضرت گیلانی کے بعد اس شان کا کوئی اور عالم پیدا نہیں ہوا۔

حضرت گیلانی میں دونوں مذکورہ خانوادوں کی روایتی اور خود ان کی ذاتی خوبیوں نے مل کر انھیں خصائص و خصائل حسنہ کا ایک پیکر بنادیا تھا، جس میں علم و فکر کی صفات کو دیکھا اور پاکیزہ سیرت کی روح پرور خوشبو کو سونگھ لیا جاسکتا تھا۔ بلند نظری، وسیع الخیالی، علمی ذوق، جامعیت، اخلاق و سیرت کی پختگی، مقصد کی لگن، مسلمانوں کی تعلیم و تربیت اور اصلاح و خدمت کا جذبۂ صادق اور کمال تقویٰ و تدین کی خوبیاں موجود تھیں اور یہ سب ان دونوں مکتبوں کی کرامات اور ان کے بزرگوں کا فیضان نظر اور ان کی کیمیا اثر صحبتوں کا نتیجہ تھا۔

دونوں مدارس کے بزرگ مجتہد الصفات اور کارفرمائے علم و نظر ہونے کے باوجود فقہ میں حنفی العقیدہ یا دوسرے لفظوں میں مذہباً مقلد تھے۔ مولانا گیلانی مرحوم فقہ میں ان کے ہم عقیدہ ہونے کے باوجود علم و نظر اور وسعتِ مسلک میں ان کے ذوق و روایت سے ذہن و فکر کی سطح زیادہ بلند رکھتے تھے۔

مولانا مرحوم میں اخلاص، ایثار، تحمل، انکسار اور اعتدال، میانہ روی، وضع داری، مفاہمت، رواداری کی انسانی صفات بھی بہت تھیں۔ تعصب، تقشف، تنگ نظری سے دوری ان کا شیوہ اور صداقت شعاری، حقیقت شناسی اور حق پسندی انکی سیرت کا خاص جوہر تھا۔

مولانائے گیلانی ایک جامع الصفات اور نادرِ روزگار شخصیت تھے۔ ان کا شمار نابغۂ عصر اور ذہین ترین علماء میں ہوتا تھا۔ اہل علم اور اصحابِ نظر نے ان کے ان اوصاف و کمالات کا اعتراف کیا ہے۔ لیکن ان کے شایان شان علمی کام ابھی تک سامنے نہیں آیا ہے۔ مولانا محمد ظفیر الدین مفتاحی نے حضرت علام پر ایک نہایت مفید کتاب تالیف فرمائی ہے۔ لیکن وہ صرف کام کا آغاز تھا۔ افسوس کہ حضرت گیلانی کی وفات کے بیالیس برسوں میں وہ پہلا ہی نہیں آخری کام بھی ہے۔ اس میدان میں ابھی تک مفتاحی صاحب کا کوئی حریف پیدا نہیں ہوا۔ اور اگرچہ ان کی زبان پر نہ سہی لیکن زمانے کی زبان پر وہی نعرۂ رستاخیز ہے جو کبھی غالب مرحوم کی زبان پر آیا تھا۔

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگن عشق   ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد

خاکسار حضرت گیلانی اور ان کے مصنف و محقق اول کا ادنیٰ نیاز مند اور انگلی کٹا کے شہیدوں میں شامل ہونے کا شائق و متمنی ہے اور دعاگو کہ:

''خدایا، کسی صاحب ہمت کو پیدا کر جو 'حیاتِ جاوید'، (الطاف حسین حالی) 'حیات شبلی' (سید سلیمان ندوی) 'حیاتِ سلیمان' (شاہ معین الدین ندوی) جیسی حیاتِ گیلانی تالیف کردے۔ جس کے ذریعے مرحوم مولانا گیلانی کے سوانح حیات، ان کی سیرت و خدمات کے اہم پہلو مرتب ہو جائیں اور حضرت مرحوم کے نادر آثار و افادات علمیہ وعالیہ تک شائقین کی رسائی ہو جائے۔ یا ہندوستان پاکستان کی کسی یونیورسٹی میں کوئی ایسا اسکالر پیدا ہو جو حیات ماجد ('عبدالماجد دریابادی۔ احوال و آثار' از ڈاکٹر تحسین فراقی۔ لاہور) اور 'حیاتِ ابوالکلام آزاد' (پروفیسر عبدالقوی دسنوی۔ بھوپال) جیسی تحقیق سے قوم پر احسان کردے!''

خاکسار کی یہ پیش کش حضرت گیلانی مرحوم کے حضور محض ایک اظہار عقیدت ہے۔

گر قبول افتد زہے عز و شرف!

حضرت گیلانی کا مقام علم و معرفت اس سے بہت بلند ہے کہ مجھ جیسا طالب علم اور آلودۂ معصیت ان پر کسی جامع علمی کام کا تصور بھی کرے۔

(ڈاکٹر) ابوسلمان شاہجہاں پوری

۲۹؍ رمضان المبارک ۱۴۲۲ھ مطابق ۱۵؍ دسمبر ۲۰۰۱ء

باب اول

شخصیت اور سوانح

شخصیت

مولانا سید مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ گذشتہ عہد تعلیم و تہذیب کی ایک نامور شخصیت تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں علم و فضل کی خوبیوں، اخلاق و سیرت کے محاسن اور ذہن و دماغ کی بہترین صلاحیتوں سے نوازا تھا اور زبان و قلم کے ذریعے مسلمانوں کی اصلاح و ہدایت اور علوم و فنون کی ترتیب و تدوین اور تصنیف و تالیف کی خدمت کی توفیق ارزانی فرمائی تھی۔ کسی ممدوح کے بارے میں یہ کہہ دینا کہ وہ جامع جہات اور ہمہ صفت بزرگ اور صاحب علم و عمل تھے، بہت آسان ہے۔ لیکن حضرت گیلانی رحمہ اللہ واقعی ایسے ہی بزرگ تھے۔ علم و عمل اور فضل و کمالات کی جامعیت اور بلندی کے ساتھ وہ اپنے پہلو میں قلب گداز رکھتے تھے۔ ان کی طبیعت میں حد درجہ انکسار تھا۔ فروتنی کی مثال تھے، انانیت سے نفور اور غرور و تکبر سے کوسوں دور تھے۔ شرافت ان پر گویا ختم تھی۔ حسد و رقابت سے ان کا سینۂ بے کینہ محض ناآشنا تھا۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے انھیں سیرت کے فضائل اور عقل و فہم کے انھیں محاسن کی بنا پر خیر الامت کے لقب سے یاد کیا ہے۔

وہ ایک روشن خیال عالم دین اور عابد و زاہد شخص تھے۔ فلسفے میں گہری نظر کے باوجود راسخ العقیدہ اور پرہیزگار بزرگ تھے۔ فلسفہ و حکمت قدیمہ کی انھوں نے استاد کی خدمت میں تحصیل کی تھی اور جدید فلسفے کے مباحث و مسائل میں ان کے ذوق نے رہنمائی کی تھی۔ وہ منطق و کلام کے نہ صرف صغریٰ کبریٰ سے واقف تھے۔ بلکہ وہ ان علوم میں خاص بصیرت رکھتے تھے۔ معقولات و منقولات میں انھیں یکساں عبور تھا۔ وہ صحافی بھی تھے۔ اور ایک بلند پایہ اور صاحبِ طرز انشاء پرداز بھی اور کئی زبانوں کے قادر الکلام شاعر تھے۔ زبان و نظم پر انھیں یکساں قدرت حاصل تھی وہ ایک کامیاب واعظ، شیریں بیان مقرر اور سوارِ خطابت کے شہسوار تھے۔ درس و تدریس میں ان کی زندگی کی طویل مہلت بسر ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ وہ ایک کامیاب مصنف تھے۔ تصنیف و تالیف کے ذوق، تعلیم و تعلم کے انہماک، عبادت

وریاضت کے شوق اور اوراد ووظائف کے معمولات کی پابندی کے باوجود سیاسی مسائل میں ان کی خاص دلچسپی رہی تھی۔ وہ اپنے استاد حضرت شیخ الہند اور مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا حسین احمد مدنی کی فکر کے حامل تھے۔ مولانا عبیداللہ سندھی کی طرح صوفیانہ انداز فکر اور فلسفۂ وحدت الوجود کو برعظیم پاک وہند میں اسلام کے روشن مستقبل کی ضمانت سمجھتے تھے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی (متوفی ۶رجنوری ۱۹۷۷ء) ان کے مقام بلند درجہ اختصاص، جامعیت علمی اور خصائص تحریر کے بارے میں فرماتے ہیں:

"دور حاضر کے علماء کے خواص میں نہیں اخص الخواص تھے۔ بلکہ کہنا چاہیے کہ اپنی وقتِ نظر یا نکتہ رسی کے لحاظ سے فرد فرید اور اپنی نظیر بس آپ ہی تھے۔"

"مولانا بیک وقت مفسر، محدث، فقیہ، متکلم، معقولی اور صوفی صافی تھے، تاریخی مطالعے کی وسعت وکثرت نے انھیں مورخ بھی بنادیا تھا۔ طلبہ اور اونچے درجے کے یونیورسٹی طلبہ کے حق میں ایک بہترین معلم بھی تھے....."

"قوت تحریر کا جو ملکہ مولانا کو حاصل تھا۔ اس سے ناظرین صدق ناآشنا نہیں۔ ایک خاص طرز انشاء کے مالک تھے اور اس میں کسی کے مقلد نہیں، خود اس کے موجد تھے۔ تحریر کا سب سے بڑا وصف بے ساختگی اور برجستگی تھی۔ جب اور جس موضوع پر قلم اٹھایا بس لکھتے ہی چلے گئے۔ جو عنوان دوسروں کو پامال نظر آتے تھے ان میں بھی وہ نئے نئے نکتوں کا انبار لگاتے چلے جاتے۔ خشکی ان کا قلم جانتا ہی نہ تھا۔ تحریر کی سطر سطر جاندار ہوتی"۔

"خیالات میں وسعت اور رواداری..... تھی۔ خوش عقیدگی اور روشن خیالی، رسوخ فی الدین اور رواداری کی ایسی جامعیت کی نظیر شاید ہی مل سکے"۔

(تحقیق گیلانی، صدق جدید، لکھنؤ ۱۵رجون ۱۹۵۶ء، ص ۴)

قاری محمد طیب مرحوم (متوفی ۱۷رجولائی ۱۹۸۳ء) لکھتے ہیں:

آپ کا جو والہانہ اسلوب تحریر میں پایا جاتا تھا وہی والہانہ رنگ تقریر میں بھی تھا۔ آپ اپنے علم وفضل، معلومات، کثرتِ مطالعہ، دقت نظر، نکتہ رسی، دقیقہ سنجی میں نادر روزگار تھے۔ ہندوستان کے مشاہیر علماء میں آپ کی ممتاز حیثیت مانی جاتی تھی۔ (۵۰ مثالی شخصیات، ملتان، ۱۴۱۸ھ ص ۴۸-۱۴۷)

حضرت مولانا گیلانی کی جامعیت علم وفن، خصائص فکر، ذہنی ودماغی کمالات اور محاسن تحریر ونگارش کے بارے میں مولانا عبدالماجد دریابادی اور قاری محمد طیب رحمہ اللہ کے بیانات کے بعد کسی اور بیان کی ضرورت نہ تھی لیکن مولانا عبدالباری ندوی مرحوم (متوفی ۲۶رنومبر ۱۹۶۷ء) ان کے بلند پایہ معاصر اور ان کی مجالس علمیہ کے ایسے رفیق اور صاحب نظر ناقد ومبصر ہیں جن کی رائے کا وزن معلوم ہے۔ اس لیے بحث کی طوالت پر قارئین کرام سے معذرت کے ساتھ مولانا مرحوم کی تحریر کا ایک اقتباس پیش کرنے کی اجازت چاہوں گا:

"یوں مولانا کے علمی وذہنی کمالات پر ایک بالکل اچنتی یا غلط انداز نظر کا عالم بھی یہ تھا کہ دس بیس منٹ میں جو پاس بیٹھ جائے ان کے تفوق سے مسحور ہوئے بغیر نہ اٹھتا۔ ہر طرح کے علمی ودینی معلومات کی بہتات، ان سے عجیب عجیب نتائج واستنباطات، پھر حسن تعبیر کی ندرت وبرجستگی، ہر چیز بجائے خود "دامن دل" کے لیے "کرشمہ دل کش" ہوتی۔ نجی ومجلسی گفتگو یا خطاب خاص سے اوپر عام خطاب یا خطابت سنیے، تو یہ کمالات اور زیادہ مبہوت کردیتے۔ تقریر سے آگے تحریر وتصنیف کو دیکھیے تو گیلانی اشہب قلم اس میدان میں بھی بڑے سے بڑے ہم چشموں سے پیچھے نہیں نہ کمانہ کیفا۔ ایک متبحر عالم دین کی میزان پر رکھیے، تو معقول ومنقول، تفسیر وحدیث، فقہ وکلام، سیرت وسوانح، تعلیم وتصوف وغیرہ وغیرہ جس شعبہ میں جو کارنامہ چھوڑا ہے کیا اس کو صفِ اول کی ممتاز جگہ سے بھی کم کسی جگہ پر رکھا جاسکتا ہے؟"

اب میں بحث کے اس پہلو پر وقت کے ایک بلند پایہ عالم دین، نامور مصنف، صاحب طرز انشاء پرداز اور مبصر کے افکار عالیہ اور رائے گرامی پر ختم کرتا ہوں، جس کا وجود گرامی مغتنمات روزگار میں سے تھا جو بیسویں صدی کے آخری تیر قضا کا نشانہ بنا ہے، جو گذشتہ دور علم وتہذیب کا خاتم اور اہل علم واصحاب فضل کی اس جماعت کا آخری فرد تھا۔ میرا اشارہ

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ (متوفی ۳۱ر دسمبر ۱۹۹۹ء) کی طرف ہے، فرماتے ہیں:

"بلا مبالغہ کہا جاسکتا ہے، وسعتِ نظر، وسعتِ مطالعہ، رسوخ فی العلم اور ذکاوت میں ان کی نظیر اس وقت ممالک اسلامیہ میں ملنی مشکل ہے۔ والغیب عنداللہ۔ تصنیف و تالیف کے لحاظ سے وہ عصر حاضر کے عظیم مصنفین میں شمار کیے جانے کے مستحق ہیں۔ انھوں نے اپنی کتابوں میں جو مواد جمع کر دیا ہے۔ وہ بیسیوں آدمیوں کو مصنف اور محقق بنا سکتا ہے۔ اس ایک آدمی نے تن تنہا وہ کام کیا ہے جو یورپ میں پورے پورے ادارے اور منظم جماعتیں کرتی ہیں۔ ان جیسا آدمی برسوں میں پیدا ہوا تھا۔ اور اب ان جیسا آدمی شاید برسوں میں بھی پیدا نہ ہو۔"

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

(پرانے چراغ جلد اول ص ۹۴)

اللہ تعالیٰ نے انھیں اخلاق کے بہترین خصائص اور سیرت کے اعلیٰ محاسن سے آراستہ کیا تھا۔ اور مواعظ و خطبات کے ذریعے مسلمانوں کے عقائد واعمال کی اصلاح، عوائد ورسوم کے خلاف جہاد اور تحریر وانشاء کے ذریعے بہترین علمی خدمات کی انجام دہی کی توفیق ارزانی فرمائی تھی۔ وہ بلاشبہ ایک جامع جہات شخصیت کے مالک تھے۔

خاندان

مولانا سید مناظر احسن گیلانی رحمہ اللہ حسنی و حسینی سادات کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے مورث اعلیٰ سید احمد جاجنیری کا تعلق مدینہ منورہ کے قریب واسط سے تھا۔ حالات کے جبر نے انھیں وہاں سے نکلنے پر مجبور کر دیا۔ وہ عراق تشریف لے گئے۔ اور بغداد کے محلے جاجنیر میں مقیم ہوگئے۔ سلطان نے ضلع مونگیر میں انھیں جاگیر عطا کی تھی۔ حضرت سید احمد جاجنیری کی اولاد میں میر شجاعت علی نامی ایک صاحبِ علم وعمل بزرگ گزرے ہیں۔ جو ہمارے ممدوح مولانا سید مناظر احسن گیلانی کے پردادا تھے۔ ان کے بیٹے سید محمد احسن نامی جید اور ممتاز عالم دین اور اپنے وقت کے معروف صاحبِ درس و تدریس تھے۔ انھوں نے

بنارس، لکھنؤ، رام پور اور دہلی کے نامور اساتذہ سے تحصیل علمی کی تھی۔ جن میں مفتی واجد علی (بنارسی)، مولانا نعمت اللہ فرنگی محلی (لکھنؤ، ف ۷۴-۱۸۷۳ء)، حضرت شاہ محمد اسحاق (دہلی، ف ۱۸۴۵ء) کے نام شامل ہیں۔ مولانا گیلانی نے اپنی تالیف لطیف "ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت" (جلد دوم) میں مولانا سید محمد احسن اور گیلان میں ان کے مرکزِ درس و تدریس اور اس کے فیضان علمی کا ذکر کیا ہے۔

مولانا سید محمد احسن (ف ۱۳۰۱ھ / ۸۴-۱۸۸۳ء) مولانا گیلانی مرحوم کے دادا تھے۔ ان کے تین بیٹے تھے۔ ابوظفر محمد سلیمان بڑے تھے، ان کا انتقال جوانی میں ہوگیا تھا۔ اس وقت ان کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ دوسرے بیٹے ابونصر عالم دین تھے۔ ان کے کوئی اولاد نہیں تھی۔ مولانا سید محمد احسن کے چھوٹے بیٹے حافظ سید ابوالخیر تھے اور یہی بزرگ ہمارے ممدوح مولانا گیلانی کے والد گرامی تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں اولاد ذکور واناث سے نوازا تھا۔ ان کے تین بیٹے تھے۔ مولانا سید مناظر احسن گیلانی اپنے دونوں بھائیوں ـــ سید مکارم احسن اور سید مظہر احسن سے بڑے تھے اور نہ صرف عمر میں بڑے تھے، اللہ تعالیٰ نے انھیں علم و عمل اور شہرت و مقبولیت میں بھی فوقیت دی تھی۔ وہ نہ صرف اپنے خاندان کے لیے موجب افتخار تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کے علم و عمل، درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں خدمات اور امتیازات کی بدولت ان کے بزرگ اساتذہ اور ٹونک اور دیوبند کے مراکز تعلیم و تدریس کے لیے بھی باعث نیک نامی بنایا تھا۔

پیدائش اور تعلیم

مولانا سید مناظر احسن گیلانی رحمہ اللہ یکم اکتوبر ۱۸۹۲ء کو اپنے ننھیال موضع استھانواں میں پیدا ہوئے۔ خاندان کی دینی، اخلاقی، تعلیمی روایات ان کے حصے میں آئی تھیں۔ ان کی ابتدائی فارسی عربی کی تعلیم ان کے چچا کے زیر نگرانی گیلانی میں ہوئی تھی اور بیشتر کتابیں خود انہی نے پڑھائی تھیں۔ تعلیم کا دوسرا دور جو تقریباً آٹھ برس کی مدت پر پھیلا ہوا تھا، ٹونک کے مدرسہ خلیلیہ میں گزرا جہاں خیر آبادی سلسلے کے نامور عالم مولانا حکیم سید برکات احمد علیہ الرحمہ مسند نشیں صدارت تھے۔ مولانا گیلانی حضرت سید برکات احمد کے درس و صحبت میں خانوادۂ خیر آبادی کے معارف حکیمیہ سے خوب خوب سیراب ہوئے۔ مدرسہ خلیلیہ میں

فلسفہ و حکمت کے جام لنڈھا چکے تو بخت کی فیروز مندی نے انھیں وقت کے سب سے بڑے محدث و فقیہ اور عارف باللہ مولانا محمود حسن کی خدمت میں پہنچا دیا جو ایشیا میں حدیث و فقہ کی سب سے بڑی درسگاہ دار العلوم دیوبند کی مسند صدارت اور شیخ الحدیث کے منصب پر فائز تھے۔ مولانا حکیم سید برکات احمد کی برکات درس وصحبت نے ان کی ذہنی و فکری صلاحیتوں کو بیدار کر کے انھیں جلا بخشی تھی اور طبع کو روشن کر دیا تھا۔ حضرت مولانا محمود حسنؒ کے فیضان تعلیم و تربیت، توجہات سامی اور صرف ہمت نے ان کی فطرت کو سعادت، طبع کو سلامتی، فکر کو جہت، سفر کو منزل، قلب کو گداز اور ایمان کو پختگی بخشی تھی۔ نیز فکر کی تیزی و براق کو سعادت سے، خیالات کی بے راہ روی کو سلامتی سے، قلب کی بے چینی اور بے یقینی کو اطمینان سے بدل کر فکر و عقیدۂ اسلامی اور سیرت حسنہ و اعمال صالحہ کا ایک قابل رشک پیکر بنا دیا تھا۔

اس کا نتیجہ تھا کہ وہ زندگی میں جہاں بھی اور جس حال میں بھی رہے مسلمانوں کے روحانی درد کے درماں کی تلاش اور جسم ملت پر بے دینی کے زخموں کے لیے مرہم کی جستجو ان کا وظیفۂ حیات رہا اور اپنی زبان و قلم ـــ دونوں سے مسلمانوں کی تعلیم و تربیت اور اصلاح افکار و اعمال کی خدمات کی انجام دہی میں مصروف رہے۔

اساتذۂ کرام

مولانا گیلانی رحمۃ اللہ کو وقت کے بڑے بڑے اساتذہ سے تحصیل علمی کی سعادت حاصل ہوئی تھی۔ وہ خود جوہر قابل تھے۔ اور قابل اساتذہ کے فیضانِ درس اور تربیت نے ان کی ذہنی و فکری صلاحیتوں کو مزید چمکا دیا تھا۔ وہ سعید ازلی تھے اور بزرگ اور عارفین کی صحبت نے سعادت کو ان کی فطرت ثانیہ بنا دیا تھا وہ ٹونک اور دیوبند میں جہاں رہے، ان کے علمی ذوق، ذہنی و فکری صلاحیتوں، ان کی سعادت مندیوں، راست فکری و نیک عملی، اطاعت شعاری اور خدمت گذاری نے انھیں اساتذۂ کرام کا محبوب اور منظور نظر بنا دیا تھا۔ حلقۂ درس و تدریس سے دائرہ اہتمام تک ان سے لطف و شفقت کا برتاؤ کیا جاتا تھا۔ اور بعض معاملات میں انھیں شریک مشورہ بھی کیا جاتا تھا۔ وہ اپنے اساتذۂ محترم کے واقعی شاگرد رشید تھے۔

ٹونک اور دیوبند میں انھیں جن اساتذہ سے استفادے کا موقع ملا تھا وہ سب وقت کے نامی گرامی اور میدان درس و تدریس کے شہسوار تھے۔ ان کے فضائل علمی اور کمالات درس

اور اخلاق و سیرت کے تعارف اور تذکرے کی گنجائش نہیں۔ ان کے مقام و مرتبہ علمی اور کارنامہ درس و تدریس کے ثبوت کے لیے یہ کافی ہے کہ حضرت گیلانی ان کے شاگرد رشید ہیں۔ درخت کی سب سے بڑی پہچان تو اس کا پھل ہی ہوتا ہے۔

۱۔ مولانا حکیم سید برکات احمدؒ مدرسہ خلیلیہ ٹونک کے بانی مبانی اپنے وقت کے نامور طبیب اور بلند پایہ معقولی تھے۔ انھوں نے ایک مدت دراز مولانا فضل حق خیر آبادی کے جانشین علم و فضل مولانا عبدالحق خیر آبادی (ف: ۱۸۹۹ء) کی خدمت میں رہ کر فلسفہ و حکمت کی بہت بلند و اعلی پیمانے پر تحصیل کی تھی۔ ٹونک میں مولانا گیلانی کا زمانۂ تعلیم ۱۳۲۴ھ سے ۱۳۳۱ھ (۱۹۰۶ء تا ۱۹۱۳ء) تک ہے۔

۲۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن:

اسی سال شوال ۱۳۳۱ھ (دسمبر ۱۹۱۳ء) میں وہ دیوبند کے مدرسۂ اسلامیہ (دار العلوم) میں داخل ہو گئے۔ اس سے واقعی تعارف تو وہیں پہنچ کر ہوا لیکن حضرت شیخ الہند کے تذکرے سے سامعۂ شوق ٹونک ہی کے زمانہ قیام میں سفر اجمیر کے موقع پر مولانا معین الدین اجمیری (ف: ۱۹۴۰ء) کی صحبت میں آشنا ہو گیا تھا۔ مولانا معین الدین اجمیری ٹونک کے خانوادۂ علم و حکمت کے نامور فرزند اور مولانا حکیم سید برکات احمد کے تلمیذ رشید تھے۔ انھوں نے ایک روز اثنائے گفتگو فرمایا تھا:

> "مولانا محمود حسن نرے مولوی اور مدرس ہی نہیں ایک خدا رسیدہ عارف ہونے کے ساتھ ساتھ ان میں وہ تڑپ بھی پائی جاتی ہے جس نے آج کل تجھے بے چین کر رکھا ہے"۔ (رسالہ دار العلوم دیوبند، محرم ۱۳۷۱ھ ص ۴۳)

اگرچہ کسی کی بزرگی اور خدا رسیدگی کو کسی کے اعتراف کی ضرورت نہیں ہوتی لیکن اہل علم اور اصحاب مجد و شرف کی روایت یہی ہے کہ وہ اپنے معاصر اور دیگر مکاتیب فکر کے اہل علم و فضل اور اصحاب تقویٰ و صلاح کے علو مرتبت کا اعتراف کرتے رہے ہیں۔

مولانا گیلانیؒ نے شریعت کے اسرار بھی حضرت شیخ الہند کے درس وصحبت میں سیکھے تھے اور طریقت کے ذوق و رموز سے حضرت ہی کی رشد و ہدایت میں آشنا ہوئے تھے۔ حضرت شیخ الہند سے نسبتِ تلمذ پر انھیں فخر تھا۔

دیگر اساتذہ

دیوبند میں جن دوسرے اساتذہ کے سامنے مولانا گیلانی نے زانوئے تلمذ تہہ کیا تھا،ان کا تذکرہ انھوں نے اپنی آپ بیتی "احاطۂ دار العلوم میں بیتے ہوئے دن" — سلسلۂ مضمون میں کیا ہے۔ان میں حضرت شیخ الہند کے علاوہ مولانا انور شاہ کشمیری (ف ۱۹۳۳ء)، مولانا حافظ محمد احمد (ف ۱۹۲۸ء)، مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی (ف ۱۹۲۹ء)، مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی (ف ۱۹۲۸ء)، مولانا شبیر احمد عثمانی (ف ۱۹۴۹ء)، مولانا غلام رسول خان (ف ۱۹۱۸ء)، مولانا سید اصغر حسین (ف ۱۹۴۵ء)، اور حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی (ف ۱۹۵۷ء) وغیرہم (رحمہم اللہ اجمعین) کے اسمائے گرامی درج ہیں۔

مولانا گیلانی رحمہ اللہ نے عربی، فارسی اور صرف ونحو کی کتابیں اپنے وطن میں اپنے فاضل چچا سے اور ان کی نگرانی میں دوسرے اساتذہ سے پڑھی تھیں۔ٹونک میں فلسفہ وحکمت ان کا خاص موضوع تھا۔دیوبند میں وہ دورہ آخر میں داخل ہوئے تھے۔شعبان ۱۳۳۲ (مطابق جون جولائی ۱۹۱۴ء) میں امتحان میں شریک ہوئے اور ۵۰۰ نمبروں میں سے ۴۸۳ نمبر حاصل کر کے درجہ اول میں کامیاب ہوئے۔

ان کے اساتذہ میں مولانا حمید الدین فراہی کا اسم گرامی بھی آتا ہے۔حضرت فراہی کو اللہ تعالیٰ نے علوم قرآنی کے خاص ذوق سے بہرہ مند فرمایا تھا۔مولانا گیلانیؒ نے ان سے حیدر آباد کے زمانہ قیام میں علوم قرآنی میں استفادہ کیا تھا۔

ذریعہ معاش کی فکر اور بعد کے حالات — ملازمت

مولانا گیلانی کی عمر تقریباً بائیس برس کی تھی جب وہ تعلیم سے فارغ ہوئے تھے۔ اس کے بعد انھیں معاش کی فکر ہوئی۔اس مقصد کے حصول کے لیے سب سے پہلے انھوں نے ٹونک کا رخ کیا۔استاد گرامی سے ملے۔مدرسہ خلیلیہ میں مدرس کی کوئی جگہ خالی نہ تھی۔کتب خانے میں فہرست سازی کا کام سپرد ہوا۔اور پانچ روپے تنخواہ قرار پائی۔لیکن دو ماہ کے اندر ہی اندر مدرسہ میں مدرس کی جگہ خالی ہو گئی اور انھیں پندرہ روپے ماہانہ پر استاد مقرر کر لیا گیا۔انھی دنوں ایک ٹیوشن کا انتظام ہو گیا۔اس طرح تینوں ذرائع سے ۲۵، ۳۰ روپے

ماہانہ آمدنی کی طرف سے اطمینان ہو گیا۔لیکن مولانا کے عزائم کے مقابلے میں نہ تو یہ کام اطمینان بخش تھے اور نہ ان ذرائع سے حاصل ہونے والی آمدنی!اس شاہین بلند پرواز کے لیے ٹونک کے آسمان کی وسعت اور مدرسہ خلیلیہ کی فضا بہت تنگ تھی۔انھیں اپنے بلند عزائم کی جولان گاہ کے لیے کسی اور جہان کی تلاش تھی۔چند ماہ کے بعد ہی مولانا نے حیدر آباد دکن کے لیے رخصت سفر باندھا۔مولانا حیدر آباد پہنچے۔بعض اکابر سے شناسائی پیدا کی۔لیکن ملازمت کی کوئی صورت نہ نکل سکی۔حالات کا جائزہ لیا اور وطن لوٹ آئے۔مادر علمی کی کشش انھیں دیوبند لے گئی۔مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ نے ان کے حالات سن کر دس روپے ماہانہ مقرر کرتے ہوئے کہا سر دست القاسم والرشید میں کچھ مضمون نویسی کرو اور درس وتدریس کا کام کرو۔انھوں نے کام شروع کر دیا۔ایک ماہ بعد انھیں معین المدرسین مقرر کر دیا گیا اور مشاہرہ تیس روپے مقرر رہا۔مفتی ظفیر الدین مفتاحی نے لکھا ہے:

"محرم ۱۳۳۳ھ یا اس کے آس پاس (مولانا گیلانی) ٹونک تشریف لے گئے۔ چار پانچ مہینے مدرسہ خلیلیہ میں درس وتدریس کے فرائض انجام دیئے۔وہاں سے نکل کر حیدر آباد پہنچے۔یہ پورا سال اسی سیر وسیاحت میں گزر گیا۔۱۳۳۴ھ کے ابتدائی مہینوں میں دیوبند واپس ہوئے"۔

اس دوران میں مولانا گیلانی مرحوم نے القاسم اور الرشید میں مضمون نگاری ہی نہیں کی تھی۔ان کی ترتیب وتدوین کی ذمہ داری بھی انھی پر تھی۔مدوّن کی حیثیت سے القاسم پر ان کا نام چھپا ہوا ملتا ہے۔مولانا نے خود اپنے تئیں دونوں پرچوں کا مدیر لکھا ہے۔ اگرچہ ضابطے کے مدیر کی حیثیت سے دوسرے حضرات کے نام چھپتے تھے۔

تعلیمی سال کے اختتام پر مولانا گیلانی وطن تشریف لے گئے لیکن نئے تعلیمی سال کے آغاز میں انھوں نے مونگیر میں ملازمت کا تعلق کرنے کی کوشش کی لیکن بات نہ بنی۔ ستمبر ۱۹۱۶ میں مولانا نے کلکتہ کا سفر کیا۔واپسی پر ایک دن کے لیے حیدر آباد میں ٹرین سے اتر گئے۔اترنے کی وجہ یہ تھی کہ ۴/اکتوبر کو عید الاضحیٰ (۱۳۳۵ھ) تھی۔سوچا تھا کہ نماز پڑھ کر اگلے روز پھر سفر شروع کر دیں گے۔مولانا نے خود لکھا ہے:

"ایک دن کی جگہ تیس سال سے زیادہ مدت حیدر آباد میں مجھے گزارنی پڑی اور یہ قدرت کا کرشمہ تھا کہ پانچ اور دس روپے کی تنخواہ سے جس کی معاشی

زندگی شروع ہوئی تھی۔ وہ ہزار روپے کی تنخواہ سے وظیفہ یاب ہو کر پھر اسی مستقر الی حسین کی طرف واپس ہو گیا، جہاں کی مٹی سے اس نے سر نکالا تھا"۔

مولانا عبدالباری ندوی مرحوم نے اپنے مفصل مضمون میں مولانا کے معاشی حالات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اس سے مولانا کے ذوقِ مزاج کا پتا بھی چلتا ہے۔ مولانا ندوی لکھتے ہیں:

(مولانا) بڑے تنخواہ دار ہونے پر بھی عملاً مالدار کبھی نہ ہونے پاتے۔ خدا بھلا کرے ان کے چھوٹے بھائی اور بڑے منتظم و کارگذار میاں سید مکارم احسن سلمہ کا کہ وہ گیلانی شریف میں کاشتکاری و باغبانی وغیرہ کے سلسلے میں منصوبے پر منصوبے برابر پیش ہی کرتے رہتے اور مولانا کے معمولی مصارف سے جو کچھ بچتا اور اچھا خاصا بچتا، جمع نہ رہنے دیتے۔ بلکہ بارہا قرض تک کی نوبت آجاتی۔ ان منصوبوں میں کچھ اسطرح کے بھی ہوتے کہ "ہماری فلاں زمین کے پاس فلاں زمین بک رہی ہے یا مل سکتی ہے، بڑے موقع کی ہے" مولانا نے ان کا غالباً ایسا ہی کوئی خط دکھایا مشورہ سنا کر فرمایا کہ "اس طرح تو پورا کرۂ ارض ہی ہماری زمین کے پاس آتے آتے گیلانی میں سما جائے گا۔ پھر بھی ساری دنیا کو خوش رکھنے والے مولانا خود اپنے بھائی کو کیسے ناخوش فرماتے۔ تاہم اگر کبھی اتفاق سے کچھ بچ جاتا تو تھوڑا بہت اپنے پرائے قرض و رض کے نام سے وصول کر لیتے، پھر دینے کا نام لینے والا شاذ و نادر ہی کوئی اللہ کا بندہ ہوتا ہوگا۔ خصوصاً جب مولانا کی طرف سے کوئی تقاضا کیا یاددہانی کا معمولی اشارہ تک دشوار تھا، ایک مرتبہ کوئی بڑی رقم غالباً ہزار پانچ سو کی اپنی ضمانت پر کسی کو دلوا دی۔ جو فرماتے تھے کہ بالآخر خود ہی ادا فرمانا پڑی"۔

ملازمت اور اس سے فراغت

حیدر آباد کی ملازمت کا سارا زمانہ مولانا نے عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبۂ دینیات میں درس و تدریس میں گزارا تھا۔ لیکچرار سے پروفیسر ہوئے۔ آخر میں شعبہ دینیات کے صدر ہو گئے تھے۔ اور اسی حیثیت سے ۳۱ر مارچ ۱۹۴۹ء کو ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ بعد کا زمانہ مولانا نے اپنے وطن گیلانی میں بسر کیا۔ عبادت و ریاضت اور مطالعہ و تصنیف میں ان کی زندگی

کے آخری ایام بسر ہوئے۔ آبائی زمین کی آمدنی اور پنشن کی رقم اتنی تھی کہ بہ اطمینان گزر بسر ہو جاتی تھی۔ اس زمانے میں مولانا نے تصنیف و تالیف کے بعض اہم کام انجام دیے۔ ۵ر جون ۱۹۵۶ء کو مولانا نے داعی اجل کو لبیک کہا اور رفیق اعلیٰ سے جا ملے۔

شادی

مولانا کی شادی تعلیم سے فراغت کے بعد داروغہ نظیر کی صاحب زادی سے ہوئی تھی۔ ایک بیٹا اور ایک بیٹی اپنے پیچھے یادگار چھوڑی۔ صاحبزادے کا نام سید محی الدین تھا۔ آزادی کے بعد پاکستان آگئے تھے۔ پنجاب کی صوبائی انتظامیہ سے متعلق اور گوجرانوالہ میں کمشنر تھے۔ ۱۹۷۰ء میں گوجرانوالہ ہی میں انتقال ہوا۔ لاہور میں آسودہ خواب ابدی ہیں۔ بیٹی ان کے منجھلے بھائی مکارم احسن کے صاحبزادے سے بیاہی گئی تھیں۔ وہ ہندوستان میں رہیں۔

مولانا کے بھائی

اوپر گزر چکا ہے کہ مولانا مناظر احسن گیلانی تین بھائی تھے۔ ہمارے ممدوح مولانا گیلانی اپنے دونوں بھائیوں سے بڑے تھے۔ سید مکارم احسن منجھلے اور سید مظہر احسن چھوٹے تھے۔ ہمارے پاس ان دونوں کے بارے میں بہت کم معلومات ہیں۔

سید مکارم احسن: سید مکارم احسن نے اپنی عملی زندگی کا آغاز کانپور میں ایک پرائیوٹ ملازمت سے کیا تھا۔ یہ تقریباً ۱۹۲۴ء کی بات ہے۔ ۱۹۲۵ء کے لگ بھگ انھوں نے حیدر آباد دکن کا سفر کیا۔ بعض دوستوں نے اصرار کیا کہ حیدر آباد میں ملازمت کا تعلق پیدا کر لیں، مولانا مناظر احسن نے ان کا یہ رجحان دیکھا تو انھیں مولانا حافظ محمد احمدؒ کے پاس لے گئے جو اس زمانے میں ریاست کے مفتی کے اعلیٰ منصب پر فائز تھے۔ مولانا مناظر احسن انہیں لے کر حضرت حافظ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور وہ انھیں لیکر ریاست کے ایک صاحب رسوخ اور اعلیٰ منصب دار کے پاس گئے اور پر زور الفاظ میں سفارش کی۔ مولانا مناظر احسن گیلانی نے مولانا قاری محمد طیب کے نام خط میں اس واقعے کا ذکر کیا ہے۔ حضرت حافظ صاحب رحمہ اللہ کی سفارش کے نتیجے میں انہیں دوسرے روز پروانۂ تقرری تو مل گیا لیکن رات کی مہلت میں سید مکارم احسن کی رائے بدل چکی تھی ممکن ہے اس میں برادر بزرگ کے ایما کا کوئی دخل ہو۔ اپائمنٹ لیٹر ہاتھ میں ضرور آگیا۔ کامیابی کی اس خوشی ہی نے

انھیں ملازمت سے بے نیاز کردیا۔ سروس جوائن کیے بغیر ہی وطن لوٹ گئے۔ کچھ عرصہ میں کان پور کی پرائیوٹ ملازمت بھی ترک کردی۔ گیلانی کو اپنا مسکن اور گھربار کی دیکھ بھال کی ذمہ داریوں کو سنبھال لیا اور زندگی بھر اسی میں مگن رہے۔

خاندان کی سرپرستی اور زمینوں کی دیکھ بھال ان ہی کے ذمے تھی۔ مولانا گیلانی سال کے سال گرمیوں کی تعطیلات میں وطن آتے تو ان کے دوست احباب اور عزیز واقارب کی گیلانی میں آمدورفت بڑھ جاتی اور گھر میں رونق آجاتی۔ حالات سے اندازہ ہوتا ہے کہ سید مکارم عزیزوں اور مولانا کے دوستوں کی تواضع میں کوتاہی نہ کرتے تھے۔ مولانا کے متعدد دوستوں نے اپنے مضامین میں ان کا ذکر اچھے الفاظ میں کیا ہے۔ مولانا کے انتقال کی خبروں اور آخری حالات کی تفصیل میں بھی ان کا حوالہ آیا ہے۔

اگرچہ وہ ایک پڑھے لکھے شخص تھے لیکن عملی زندگی کے انہماک نے انھیں علمی اور فکری اثرات سے ہر طرح محفوظ رکھا۔ کسی علمی مسئلے میں ان کا تذکرہ کبھی سننے میں نہیں آیا۔

اگرچہ ان کے نام سے الرشید، دیوبند بابت ماہ ذی قعدہ ۱۳۳۴ھ (ستمبر ۱۹۱۶) میں "نوائے قدس (فارسی) اور ذی الحجہ ۱۳۳۴ھ (اکتوبر ۱۹۱۶ء) میں طیب الہند (اردو) کے عنوان سے دو نظمیں ان کے نام کی صراحت کے ساتھ چھپی ہیں اور ان کے ساتھ "مسمار" تخلص بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ لیکن اسکے سوا زندگی بھر ادب وشعر سے ان کے تعلق کا پتا نہیں چلتا۔ نہ کبھی مضمون نگاری کی طرف متوجہ نظر آتے ہیں۔ نہ کسی علمی بحث میں مصروف ملتے ہیں۔ مولانا (برادر بزرگ) رحمہ اللہ سے مراسلت کا تعلق زندگی بھر رہا لیکن اس مراسلت کا بھی ابھی تک کوئی نشان نہیں ملا۔ معلوم نہیں محفوظ بھی ہے یا نہیں۔ اگر یہ مراسلت محفوظ ہو تو بلاشبہ مولانا علیہ الرحمہ کے سوانح خصوصاً خاندان کے حالات کی بڑی قیمتی دستاویز ہوگی۔ الرشید میں ان کی جو دو نظمیں ملتی ہیں وہ اس زمانے کی ہیں جب مولانا گیلانی تعلیم سے فراغت کے بعد دیوبند گئے تھے اور الرشید اور القاسم کی ترتیب کی ذمہ داری ان پر آگئی تھی۔ نظموں کا مضمون، ان کی زبان اسلوب وغیرہ اسی بات کے غماز ہیں کہ یہ کلام حضرت مولانا گیلانی مرحوم کے رشحات فکر وقلم کی یادگار ہے۔ اس لیے یہ دو نظمیں اس تالیف میں حضرت گیلانی کے کلام کے طور شامل کرلی ہیں۔ لیکن اگر کوئی محترم فاضل اس سے متفق نہ ہوں تو انھیں حق ہے کہ وہ اسے

سید مکارم مرحوم کا کلام سمجھیں۔ اس صورت میں بھی ضروری تھا کہ ان کی علمی وادبی زندگی کی تنہا یادگار یہ نظمیں محفوظ ہوں۔ ممکن ہے آیندہ تحقیق کا قدم آگے بڑھے اور اس بارے میں قطعیت کے ساتھ کوئی بات کہی جاسکے۔

حضرت مولانا گیلانی مرحوم سے انہیں بہت تعلق خاطر تھا۔ وہ بھائی کے بڑے خدمت گذار تھے۔ بھائی کے انتقال کا انھوں نے بڑا ماتم کیا تھا۔ ان کی پیدائش کی تاریخ کہیں نظر سے نہیں گزری۔ نہ انتقال کی خبر سے یہ پتہ چلا کہ اس وقت ان کی عمر کتنی تھی۔ دسمبر ۱۹۸۰ء یا جنوری ۱۹۸۱ء میں ان کا انتقال ہوا۔ صدق جدید میں خبر شائع ہوئی کہ مولانا مناظر کے چھوٹے بھائی مکارم احسن کا انتقال ہوگیا:

"حکیم عبدالاحد (پٹنہ) نے اطلاع دی ہے کہ مولانا مناظر احسن گیلانی کے چھوٹے بھائی مکارم احسن کا حال ہی میں انتقال ہوگیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

مرحوم نے خاصی طویل عمر پائی۔ گھر اور جائداد کا سارا کام مولانا مرحوم کی زندگی میں بھی یہی دیکھتے تھے۔

ایک بار مولانا مناظر احسن کے ہمراہ دریاباد بھی تشریف لائے تھے اور گھوم پھر کر قصبے کا چپہ چپہ دیکھا تھا۔ اور جب مولانا دریابادی مولانا گیلانی کے وطن "گیلانی" تشریف لے گئے تھے تو انھوں نے وہاں خیر مقدم کرکے وہاں کی ایک ایک چیز ان کو دکھائی تھی۔ مولانا دریابادی کے انتقال پر ان کا بڑا ہی موثر تعزیت نامہ آیا تھا"۔

یہ شذرہ ۲۳؍ جنوری ۱۹۸۱ء کے صدق جدید میں شائع ہوا تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سید مکارم احسن کا انتقال دسمبر ۱۹۸۰ء یا جنوری ۱۹۸۱ء کے پہلے ہفتے میں ہوا ہوگا۔

سید مظہر احسن: حضرت گیلانی کے سب سے چھوٹے بھائی سید مظہر احسن گیلانی تھے۔ ان کی تربیت انھیں حیدرآباد لے جانے اور ملازمت دلانے میں مولانا گیلانی رحمہ اللہ کا بڑا حصہ تھا۔ ۵؍ ستمبر ۱۹۷۷ء کو حیدرآباد میں انتقال ہوا۔ صدق جدید کے ایک ادارتی نوٹ سے معلوم ہوا:

"مولانا گیلانی کے خاندان کے ایک فرد جناب ایم مظفر گیلانی کے مکتوب سے جو ۲۶ ستمبر کو موصول ہوا۔ یہ افسوسناک خبر ملی کہ مولانا مناظر احسن گیلانی کے سب سے چھوٹے بھائی مظہر احسن صاحب گیلانی جو عثمانیہ یونیورسٹی میں

معاشیات کے ریڈر اور بڑے مخلص صدق نواز تھے۔ ۵/ ستمبر کو ماہ رمضان میں یکایک ایک مختصر لیکن شدید علالت کے باعث روزہ کی حالت میں قبل اس کے کہ علاج معالجے کی کوئی ادنیٰ تدبیر بھی ہو سکے راہی جناں ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مظفر گیلانی صاحب کا مکتوب پرچے میں درج کیا جارہا ہے۔

مظہر مرحوم صدق جدید کے عاشق زادوں میں تھے۔ مولانا دریابادی ان سے اور وہ ان سے خاص تعلق رکھتے تھے۔ ان کی وفات پر ان کا بڑا ہی دردناک تعزیت نامہ آیا تھا۔ عم محترم فرماتے تھے کہ ان کی آواز مولانا گیلانی مرحوم کی آواز سے بہت مشابہ تھی۔ اس لیے جب وہ حیدر آباد گئے تھے تو نماز کی امامت ایک موقع پر انھیں سے کرائی تھی کہ اس طرح مولانا گیلانی کی سی آواز ان کی وفات کے بعد سننے کو ملے۔

صدق جدید میں کبھی کبھی ان کے مراسلے بھی نکلے ہیں۔ اللہ تعالیٰ مراتب بلند عطا کرے۔ مولانا دریابادی کی وفات کے بعد ایسا نظر آرہا ہے کہ ان کے خصوصی مخلصین اور عزیز بھی رفتہ رفتہ اس دنیا سے اٹھتے جا رہے ہیں"۔

(صدق جدید، لکھنؤ ۳۰/ ستمبر، ۷/ اکتوبر ۱۹۷۷ء، ص ۲)

مرض الموت

حضرت گیلانی کی زندگی اور موت دونوں "عاش حمیداً ومات حمیداً کی مثال تھیں۔ دونوں قابل رشک تھیں۔ ہم ان کی سادہ و تکلفات سے پاک زندگی تو شاید اختیار نہ کر سکیں کہ یہ ہمارے بس کی بات نہیں لیکن ان کی جیسی موت کی ہم آرزو ضرور کر سکتے ہیں اسباب و وسائل معاش کے لحاظ سے ان کی زندگی میں فراغت ہی کی کیفیت رہی لیکن انھوں نے اپنے رہن سہن، لباس، خوراک کے انداز و معیار اسباب راحت میں قناعت پسندی، تکلفات سے بے نیازی سے اپنی زندگی کو اتنا سادہ اور آسان بنالیا تھا کہ اگر انہیں معاش کی وہ فراغت حاصل نہ ہوتی یا کسی وقت چھن جاتی، تب بھی انھیں کوئی تکلیف نہ ہوتی۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں ایسی ہی آسان اور دکھ تکلیف سے خالی موت عطا فرمائی۔ ان کے چھوٹے بھائی مولوی مکارم احسن

گیلانی نے مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام ایک تحریر میں ان کی بیماری اور رحلت کی پوری کیفیت بیان کر دی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"قلب پر حملہ متواتر تین سال سے ہوتا رہا، اور اکثر اتنا شدید حملہ ہوا کہ ہم لوگ تو یہی سمجھے کہ بس اب وقت آگیا۔ مگر ہر بار سکون ہو جاتا، ہفتہ دو ہفتہ قائم رہتا کہ پھر وہی حال ہو جاتا۔ مرض قلب کا ہر ممکن ڈاکٹری علاج موجودہ زمانہ کے مطابق ہوتا رہا۔ چنانچہ رمضان المبارک میں بھی دو شدید حملے ہوئے۔ شوال میں سکون ہی سکون ایک حد تک رہا۔ یہاں تک کہ ۴/ جون (۲۴/ شوال) کو کچھ عجیب علامات نمودار ہوئیں۔ دن میں بہ کثرت اشعار فنا کا مضمون لیے ہوئے وجد کے ساتھ پڑھتے اور گنگناتے رہے (مولانا کی خوش الحانی کا حال تو آپ کو معلوم ہی ہے) مثلاً فانی بدایونی کا یہ شعر:

سنے جاتے نہ تھے تم سے، مرے دن رات کے شکوے
کفن سرکاؤ میری بے زبانی دیکھتے جاؤ!

اور ہر چھوٹے بڑے سے گھر کے لڑکوں سے خوش کلامی کرتے رہے بلکہ کمرے کے اندر اور کچھ باہر ذرا چہل قدمی بھی کر لی۔ رات آئی۔ تو وہی خوشی خرمی اور شعر و غزل کی تکرار۔ یقین کیجیے کہ بھائی صاحب کو اتنا مسرور برسوں سے میں نے نہیں دیکھا تھا۔ اور یہ دیکھ کر میں خود اور گھر کے سب لوگ مسرور تھے۔ گیارہ بجے وہ سو گئے۔ میں بھی قریب ہی لیٹ گیا۔ نماز فجر کے وقت ہم دونوں جاگے۔ میں حسب معمول مسجد چلا گیا اور انھوں نے کمرے ہی میں نماز ادا کی۔

عام دستور ان کا نماز فجر کے بعد بھی کچھ سو رہنے کا تھا۔ میں نے تکیہ وغیرہ درست کر دیا، اور وہ سو گئے۔ ایک گھنٹہ گزرا ہوگا کہ میرے منجھلے لڑکے نے محسوس کیا کہ سانس تیز چل رہی ہے۔ چند منٹ میں معتدل ہو گئی۔ لیکن دو ہی ایک منٹ بعد بالکل بند ہو گئی اس کو شک ہوا۔ مجھ کو متوجہ کیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ روح پرواز کر چکی ہے۔ آنکھیں بند ہیں اور لبوں پر مسکراہٹ ہے۔ چند منٹ کے اندر خبر جوار بھر میں پھیل گئی۔ تھوڑی ہی دیر

میں مسلمان ہر طرف سے جوق در جوق آنے لگے۔ بہار شریف سے متعدد علماء بس پر آئے اور انھوں نے غسل و تجہیز و تکفین کا نظم اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ بعد نماز ظہر جنازہ پڑھا گیا۔ نماز میں اس قدر ہجوم تھا کہ ایک بہت بڑے میدان کو تلاش کرنا پڑا۔ گیلانی کے لیے یہ ایک نئی بات تھی۔

ایک بات جو عام طور پر کہنے کے لائق نہیں۔ آپ کو لکھے دیتا ہوں آپ کے یہ محبوب دوست تین سال سے مرض اور پرہیز کی سختیاں جھیل کر اب صرف چرم و استخوان ہو کر رہ گئے تھے۔ لیکن روح کے پرواز کرتے ہی چہرہ نوجوانوں کا سا ہو گیا تھا، فربہ، خوش رنگ، سرخ۔ داڑھی کے بال سیاہ ہو گئے۔ غسل کے وقت جسم پر گوشت تھا اور سینہ چوڑا پہلوانوں کا سا ہو گیا تھا۔ علماء نے یہ منظر دیکھا اور سب حیرت زدہ تھے۔ خاندانی قبرستان میں جو گھر کے قریب ہی ہے۔ مولانا ہی کے لگائے ہوئے باغ انبہ کے وسط میں جو آج کل پھلوں سے لدا ہوا ہے۔ جگہ ملی عجب سماں پیدا تھا۔

(صدق جدید، لکھنؤ، ۲۳ جون ۱۹۵۶ء ص ۱۔۲)

وفات

ایک اور خط میں سید مکارم احسن گیلانی لکھتے ہیں:

"وصال سے ایک ماہ قبل طبی اعتبار سے حالت گرتی جاتی تھی، لیکن شادمانی اور بشاشت بڑھتی جاتی تھی اور احباب سے دن رات کچھ نہ کچھ روحانی گفتگو کا سلسلہ حد سے زیادہ بڑھ گیا تھا۔ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ بیمار بھی ہیں۔ دو چار دس خط روزانہ لکھ لیا کرتے تھے، دو چار گھنٹے کتب بینی، پرچہ بینی بھی کر لیتے تھے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ میرے منجھلے لڑکے میاں جمال احسن سلمہ کو..... ایک گھنٹہ عربی بھی آخری ہفتہ زندگی میں پڑھانا شروع کیا۔ دیوان حافظ اور مثنوی مولانا روم کا درس بھی اس بچے کو دینا شروع کیا..... آخری مہینے میں زیادہ تر وعظ دو باتوں پر ہوتا تھا:

—اول یہ کہتے تھے کہ موت کے بارے میں عوام میں یہ غلط مشہور ہے کہ

سکرات کی تکلیف موت میں ہوتی ہے۔ بلکہ موت نام ہے ایک قسم کی نیند کا۔

— دوم۔ بار بار بلکہ ہزار بار کہا کہ جنت میں کوئی بوڑھا نہ جائے گا، پہلے جوان کر دیا جائے گا......

یہ دونوں چیزیں تو ان آنکھوں نے بلکہ سینکڑوں آنکھوں نے دیکھیں۔ بوجہ سہ سالہ شدید مرض قلب کے لاغر ترین ہو گئے تھے۔ اول تو خاموش طریقے سے دوامی نیند آہی گئی۔ دوم روح پرواز ہوتے ہی جوان و توانا کر دیے گئے۔ اچانک جوان دیکھ کر ہی میں نے جانا کہ اب یہ نہیں ہیں۔ فربہ سرخ چہرہ، سینہ چوڑا ابھاری، گردن موٹی، داڑھی سیاہ۔ علماء نے غسل دیا تو سب کو یہ سماں دیکھ کر حیرت تھی۔ بعد غسل میت کمرے سے حویلی گئی۔ چہرہ کھول کر بستی کی اور گھر کی عورتوں نے دیکھا تو سب ایک زبان بول اٹھیں کہ یہ تو پچیس برس کے جوان ہیں۔ داڑھی سیاہ ہو جانے کا چرچا ہر طرف تھا۔"

(صدق جدید، لکھنؤ، ۲۱ ستمبر ۱۹۵۶ء، ص ۶)

قطعہ تاریخ وفات

مولانا گیلانی کی وفات پر متعدد شعرائے کرام نے منظومات میں اپنے رنج و غم کا اظہار کیا اور قطعات تاریخ وفات کہے۔ ان میں ایک مولانا مرحوم کے دوست، قدر دان نامور شاعر حاجی محمد اصطفا خان لکھنوی (ف ۲۸/ مارچ ۱۹۶۳ء) بھی تھے۔ یہ بزرگ ۱۹۴۷ء کے بعد ترک وطن کر کے پاکستان چلے گئے تھے۔ کراچی میں کاروبار کر لیا تھا۔ اور وہیں مقیم ہو گئے تھے۔ مشرقی تہذیب کا نمونہ اور ایک مجلسی یادگار شخصیت تھے۔ انھوں نے جو تاریخی نظم کہی تھی اس میں نہ صرف تاریخ وفات ہے تاریخ ولادت بھی موجود ہے۔ اور نہ صرف شاعرانہ محاسن اور فنی خوبی کی بنا پر یادگار ہے بلکہ اس میں انھوں نے مولانا گیلانی کی شخصیت، زندگی کے بعض خصائص اور ان کی پاکیزہ سیرت کی تصویر بھی کھینچ دی ہے۔ امید ہے قارئین کرام اسے ضرور پسند فرمائیں گے۔ نظم یہ ہے:

تاریخ رحلت پاکیزہ باطن	شمع انجمن مولوی مناظر احسن
۱۹۵۶ء	۱۹۵۶ء

(از حاجی محمد اصطفا خان صاحب لکھنوی ثم کراچوی)

دار فانی سے سدھارے افسوس — علم تاریخ کے اک ماہر فن
نام سے سال ولادت ہے عیاں — دیکھو اعداد مناظر احسن
۱۳۱۰ھ

آپ مشہور ہوئے گیلانی — آپ کا قصبہ گیلان ہے وطن
ہند میں شہر ہے پٹنہ مشہور — اس میں قصبہ ہے یہ مشہور زمن
مائل باعمل وحامی دیں — ماحی بدعت و اوہام شکن
سخت سے سخت علالت میں کبھی — صبر کا ان سے نہ چھوٹا دامن
تھے سخن فہم بہت شاعر کم — دل کے بہلانے کو تھا شغل سخن
حیدر آباد میں کی خدمتِ خلق — یاد رکھیں گے انھیں اہل دکن
ایک مخزن ہے تصانیف ان کی — رہنے والی ہے جو مثل معدن
مغفرت ان کی کر، اے رب کریم! — تھی انھیں تیری محبت کی لگن
قربِ خاص ان کو عطا کر یارب — قصرِ رحمت بنے ان کا مسکن
مہبطِ نور لحد بن جائے — ازپئے روح مناظر احسن
بارشِ نور قیامت تک ہو — مہبطِ رحمتِ حق ہو مدفن
شامیانہ تری رحمت کا رہے — فرق پر حشر کے دن سایہ فگن
لکھیے تاریخ دعاؤں کے بعد — کہ چلی آتی ہے یہ رسم کہن

اصطفا! سالِ وفاتِ مرحوم
لحد پاک — مناظر احسن
۱۳۷۵ھ

(صدق جدید، لکھنؤ۔ ۵/اکتوبر ۱۹۵۶ء، ص ۷)

لوحِ مزار

یہ تو معلوم نہیں کہ مولانا کی قبر کی کیا حالت ہے، اس پر کوئی سائبان احاطہ ہے یا نہیں اور قبر پر کوئی کتبہ ہے یا نہیں؟ لیکن ان کے دوست اور مخلص اس سے غافل نہ تھے۔ ان کے ایک حیدر آبادی قدر دان اور مخلص حکیم الشعراء سید احمد حسین امجد (ف ۱۹۶۱ء) نے لوح مزار و قطعہ تاریخ وفات لکھ دیا تھا اور حضرت مولانا کے ایک شاگرد مخدوم محی الدین (ف

اگست ۱۹۶۹ء) نے صدقِ جدید، لکھنؤ بابت ۴/اکتوبر ۱۹۵۷ء میں چھپوا دیا تھا۔ یہ قطعۂ تاریخ رحلت اور لوح مزار ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الا ان اولیاء اللہ لا خوف علیهم ولا هم یحزنون

قطعۂ تاریخ رحلت

مولانا السید مناظر احسن الگیلانی۔ رئیس شعبۃ الدینیات للجامعۃ العثمانیۃ حیدر آباد دکن۔ الی دار البقاء۔
من خلیلہ وصفیہ حکیم الشعراء السید احمد حسین امجد حیدر آبادی

جان بحق داد مرد حق آگاہ — دفن شد گنج علم در مدفن
بسر آہ گفتم اے امجد! — خواب گاہے مناظر احسن
۱۹۵۶ء

ولادت۔ مناظر احسن رضی عنہ اللہ الولی الوکیل ۹/ربیع الاول ۱۳۱۰ھ
وفات۔ " " " ۲۵/شوال ۱۳۷۵ھ

خانک لم تبعد علی متعہد — بلی! کل من تحت التراب بعید
من تلمیذہ وممنون برہ ومتشکر لاحسانہ محمد مخدوم محی الدین الحیدر آبادی۔

اخلاق وسیرت

اخلاق

حضرت مولانا گیلانی میں اللہ تعالی نے سیرت کے بہت سے محاسن اور اخلاقی کمالات کو جمع فرمادیا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ اپنے اقران وامثال کی ایک محبوب ہستی بن گئے تھے۔ ان کے تمام مصنفین اور مضمون نگاروں نے ان کی سیرت اور اخلاق کی خوبیوں پر روشنی ڈالی ہے۔ یہاں میں صرف مولانا عبدالماجد دریاآبادی کے افکار ومعلومات سے قارئین محترم کی ضیافت طبع کا سروسامان کرتا ہوں۔ مولانا فرماتے ہیں:

"مزاج میں انتہائی سادگی اور بے تکلفی تھی۔ اپنی بڑائی اور اپنے کمالات کا شاید وسوسہ بھی کہیں نہیں پیدا ہوا۔ اپنے سے چھوٹوں اور کہیں چھوٹوں کی بات کو اس التفات سے سنتے کہ وہ گویا ان کے ہمسر ہیں۔ بلکہ بعض اوقات تو اپنے چھوٹوں کو اتنا بڑھاتے کہ وہ بے چارے خود اپنے متعلق بڑی غلط فہمیوں میں مبتلا ہو جاتے! بے تکلف وبے ساختہ طرز انشاء اور بے تصنع وپرجوش رنگ تقریر دونوں اس سرشت وطینت کے پرتو تھے۔ تحریر وتقریر دونوں میں بس معلوم ہوتا تھا ایک دریا ابلا پڑ رہا تھا۔

طبیعت کے لحاظ سے اتنے وارستہ تھے کہ کھانے کو جو مل گیا بس اسی کو غنیمت سمجھتے۔ پہننے کو جو کچھ ملا خوش ہو کر پہن لیا۔ رہنے سہنے کا جو ادنا سا ادنا معیار بھی وقت کے ساتھ نصیب ہو گیا۔ اسی میں مگن زندگی گذار دی۔ ایک زمانے میں موٹر بھی رکھا۔ لیکن ان کے لیے موٹر اور رکشہ اور جھٹکا اور پیدل سب برابر ہی تھے۔ بڑے رقیق القلب، بڑے رحم دل، بڑے نرم مزاج تھے۔ دوسرے سے اپنی بات منوانے کے فن سے واقف ہی نہ تھے۔ کسی ادنا شخص کی بھی ناخوشی نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اسے آزردہ دیکھ کر بلاوجہ اور خواہ مخواہ بھی اپنی غلطی تسلیم کرتے اور اسے منانے میں لگ جاتے۔

دوسروں کی امداد کا حوالہ دینے میں ذرا بھی بخیل اور تنگ دل نہ تھے۔ ہر ادنا امداد کا حوالہ بھی بڑی فیاضی اور خوش دلی سے دیتے۔ اور اس کی بشارت میں آج اس دنیا میں بھی دیتا ہوں اور کل ان شاء اللہ حشر میں بھی دوں گا کہ اپنی ۳۶۔۳۷ سال کے تعلق وارتباط کی لمبی مدت میں ایک بار بھی اپنی بڑائی کا کوئی کلمہ ان کی زبان سے سننے میں نہ آیا۔

یہ سارے اوصاف معمولی نہیں غیر معمولی ہیں"۔

(صدق جدید، لکھنؤ، ۱۵رجون ۱۹۵۶ء)

مولانا سید صباح الدین عبدالرحمن حضرت گیلانی کے عقیدت کیش اور مشہور اہل قلم اور نامور مصنف تھے۔ انھوں نے مولانا کو دور ونزدیک دیکھا تھا۔ اور مولانا کے معاصرین سے ان کا قریبی تعلق تھا۔ وہ اپنا مشاہدہ ومطالعہ مولانا کے بارے میں یہ بیان کرتے ہیں:

"وہ اپنی فضیلت اور بزرگی کی داد لینے یا سننے میں ہمیشہ مستغنی اور بے نیاز رہے۔ حالانکہ وہ خود ہم عصروں کے کمال کی داد دینے میں بڑے فیاض تھے۔ بلکہ بعض دوستوں کے اوصاف بیان کرنے میں تو قصیدہ خواں ہو جاتے۔ ان کے ہم چشموں میں شاید ہی کسی کو ان کی تحریر سے کوئی تکلیف پہنچی ہو۔ ان کی طبیعت میں بڑی مٹھاس تھی۔ اس لیے نجی گفتگو میں بھی ان کی زبان سے کوئی ایسی بات نہ نکلتی جس سے کسی کی دل آزاری ہو۔ بعض اوقات تو اس شفقت ومحبت میں نو آموز اہل قلم کے لیے ایسے تعریفی کلمات لکھ جاتے جن کا وہ مستحق نہ ہوتا۔ لیکن ان کی تعریف یا داد بڑھانے اور کام کا حوصلہ پیدا کرنے کی خاطر ہوتی اور ان کی اس مخلصانہ فراخ دلی نے ان کے بہت سے شاگردوں کو اہل قلم اور مصنف بنادیا۔ اور ان کے احباب تو ان کے علم وفضل کے علاوہ ان کی سیر چشمی، رواداری، جوہر شناسی، قدردانی، مرنجاں مرنج طبیعت اور مزاج کی شگفتگی سے ہمیشہ ان کے گرویدہ رہے"۔ (بزم رفتگاں، ص ۲۹۴)

خاکساری وفروتنی

مولانا عبدالباری ندوی مرحوم نے ایک قرن ان کے قرب وصحبت میں گذارا تھا۔

اور انھیں اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، خلوت وجلوت میں دیکھا تھا، ان کی زندگی میں سیرت کی جو بڑی خوبی انھیں نظر آئی، وہ ان کی بے غرضی، پاک نفسی، کبر ونخوت سے دوری، خاکساری، اور فروتنی اور عجز وانکسار تھا۔ انھوں نے اپنی ذات کی بالکل نفی کر دی تھی اور انانیت کو مٹا دیا تھا۔ مولانا ندوی مرحوم نے "مکاتیب گیلانی" کے مقدمے میں ان کی شخصیت کے اس پہلو پر روشنی ڈالی ہے۔ فرماتے ہیں:

"۲۳۔۲۴ سال اس دنیا میں ان سے دور ونزدیک کے تعلقات کی سعادت حاصل رہی۔ ان میں بھی قریباً چوتھائی صدی کی طویل ومسلسل قیام وطعام خلوت وجلوت، سفر وحضر، صحت ومرض وغیرہ کے ہر حال میں شب وروز کی یکجائی ورفاقت کی بدولت جس طرح جتنا موقع ان کے علمی وعملی، دینی ودنیوی، ظاہری وباطنی احوال کو قریب سے دیکھنے کا نصیب رہا، یقیناً اس خوش نصیبی میں کوئی دوسرا شریک نہیں۔ آج ان سطروں کو سپرد قلم کرتے اور از سر نو اس طویل ومدید معیت ورفاقت کا پوری احتیاط کے ساتھ جائزہ لیتے ہوئے ذمہ داری کے پورے احساس کے ساتھ شہادت ادا کر رہا ہوں کہ مولانا مرحوم میں جو بھی کمزوریاں رہی ہوں ـــ اور معصوم کون بشر ہوتا ہے ـــ لیکن جہاں تک دل کا تعلق ہے کہنا چاہیے کہ اس کی تمام بیماریوں سے ان کو پاک ہی پاک پایا۔ بغض وحسد، انتقام وعداوت، ریا ونفاق، نمود ونمائش، حرص وہوس، طول امل وغیرہ کے نفسانی جذبات کا کوئی داغ دھبہ یا پرزوو ڈالنے سے بھی، ان کے آئینہ دل پر پڑتا خصوصاً ٹھہرتا قطعاً یاد نہیں پڑتا۔ ہمارے علم وقلم کے نیچے اونچے نام والے صلحا بھی ذرا ٹھنڈے دل سے خود اپنے دلوں کا محاسبہ فرما دیکھیں، تب ہی دل کی ان بیماریوں کی ہمہ گیری اور گیلانی جیسے صاحب علم وقلم کی ان سے اتنی استثنائی وکرامتی دوری کی قدر وقیمت معلوم ہوگی"۔

"سارے اخلاقی رذائل یا باطنی امراض سچ پوچھیے تو کبر ونخوت، خود بینی وخود پرستی ہی کی شیطانی ذریت یا انڈے بچے ہوتے ہیں مگر مولانا کی ہر شان پر غالب خود فراموشی یا فنائیت تھی، کچھ تو پیدا ہی مست وفانی ہوئے

تھے، کچھ ذہانت وذکاوت کی افراط کا لازمہ بھی عموماً کچھ نہ کچھ مستی وربودگی ہی دیکھی جاتی ہے۔ پھر وجودی توحید جو مولانا کا خاص مذاق تھا یہ نام ہی صحیح معنی میں "خودی" سے گذر جانے یا اس کے فنا ہو جانے کا ہے۔ سونے میں سہاگہ حیدر آباد میں ان کو ایک مرشد بھی اس رنگ میں شرابور ملے۔ حال وقال سب کے مست ہی مست، بیداری کا ہر لمحہ سرور ومستی کا دیکھا۔ جس کی آنکھوں میں خدا کی عظمت وکبریائی، کیا اس کی ہستی اتنی سمائی ہو کہ اپنی پرائی کوئی دوسری ہستی "ہستی"، ہی نہ دکھائی دیتی ہو، اس کو من وتو یا اپنی کبریائی اور بڑائی دوسروں پر جتانے جمانے کا ہوش کیا رہ سکتا ہے۔ خود فراموشی کا عالم مولانا کی ظاہری زندگی پر بھی اتنا چھایا رہتا کہ کھانا پینا، سونا جاگنا ہر چیز کسی نظم وانتظام سے قطعاً آزاد رہتی، خود تو کیا تہہ فرماتے نوکر بھی آزاد رہتا، اگر وہ بھی تہہ نہ کرتا تو دن رات بستر تک الجھا ہی پڑا رہتا۔"

"اس خود فراموشی میں خود فروشی وخود پرستی کی سمائی تو کہاں سے ہوتی، معمولی خودداری تک سے بے نیازی کا ہمارے مولانا کا ایک بالکل خاص بہت ہی عجیب نادیدہ وناشنیدہ استثنائی حال پایا۔ کسی بڑے چھوٹے بلکہ ادنی سے ادنی نوکر چاکر تک کی ادنی سے ادنی ناخوشی کا تحمل مطلق نہ فرما سکتے۔ راقم گستاخ نے تو حیدر آبادی رنگ کا ایک مستقل خطاب ہی "خوش کرن" دے رکھا تھا۔"

"اپنی معذوری ومعذرت کا ایک دلچسپ عنوان پا کر خود بھی اس سے فائدہ اٹھاتے، بعض مکتوبات میں بھی ناظرین کو "بد خوش کرنی" کے دامن میں پناہ لیتے ملیں گے۔ ایک مرتبہ کسی معاملے میں خود راقم نالائق کو شاید کچھ زیادہ ناخوش محسوس فرما کر تو غضب ہی فرمایا کہ دھڑ سے پیروں پر گر پڑے، گھبرا کر ان کے سر کو اٹھا کر سینہ سے لگا لیا۔ اور دونوں لپٹ کر خوب روئے، خیر میرا شمار تو پھر بھی بظاہر برابر والوں میں تھا۔ بارہا ہر کس وناکس کے ساتھ اپنے دینی ودنیوی اور علمی مرتبہ ومقام سے کیا معمولی انسانی خودداری تک سے اتنا اتر آتے کہ ان کی اس خاص افتادِ طبع سے ناواقفوں کو

خوشامد کا شبہ ہونے لگتا۔ کبھی کبھی مجھ سے دیکھا نہ جاتا اور ناگواری سے کہتا کہ آخر ساری خدائی کو خوش رکھنا آپ نے کیوں اور کیسے اپنے اوپر فرض ٹھہرا رکھا ہے۔ اور اس میں کیسے کامیاب ہو سکتے ہیں۔"

(مقدمہ مکاتیب گیلانی، ص ۴۴۔۴۲)

ذہانت وطباعی

مولانا کے ذہن کی تیزی اور دراکی کا ان کے تمام مصنفین نے ذکر کیا ہے۔ مولانا عبدالباری ندوی مرحوم نے تو ان کے ساتھ زندگی کا ایک قرن گزارا تھا۔ اور ایک مدت تک قرب وصحبت اور مذاکرہ وکلام کے بے شمار مواقع میسر آتے رہے تھے۔ ان کی نظر سے مولانا کی تحریریں بھی گزرتی تھیں۔ مولانا عبدالباری ندوی کے نزدیک وہ خطرناک حد تک ذہین تھے۔ لیکن ان کے طبع کی سلامتی انھیں ہمیشہ ہر خطرناک مقام سے بہ حفاظت نکال لے گئی۔ لیکن ان کے قارئین کے لیے یہ خطرہ موجود ہوتا تھا۔ عوام اور سطحی معلومات کے پڑھے لکھے اور تشکیک کے شکار جدید تعلیم یافتہ ان کی علمی نکتہ آفرینیوں میں اُلجھ بھی سکتا تھا۔ حضرت گیلانی کو ان خطرات کا اندازہ تھا۔ اس لیے انھوں نے ایسے مواقع پر اپنے سمند فکر وطبع کی باگ کو کھینچے رکھا اور قارئین کی عام سطح فہم اور ان کے اوسط ظرف وتحمل کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنی ذہانت وطباعی کا مظاہرہ برائے مظاہرہ نہیں کیا اور اصلاحِ فکر وعمل کے مقصد کو کبھی نظر سے اوجھل نہیں ہونے دیا۔ مولانا عبدالباری ندوی مرحوم نے اس طرف اشارہ کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

"حضرت گیلانی (جعل الله فی قبره نورا کما جعل فی قلبه نورا) کے ذہنی ودماغی، علمی وقلمی گوناگوں کمالات کسی تعریف وتعارف کے محتاج نہیں۔ خصوصاً اس بے علم کے قلم سے البتہ اس سلسلہ میں ایک بڑے خاص کمال کا علم واندازہ جتنا اور جیسا کہ چاہیے لوگوں کو کم ہے۔ وہ ان کی بہت خاص الخاص قرآن مجید کی فہم وتفہیم تھی۔ ان کی انفرادی وفکری بڑائیوں میں راقم ہٰذا کی نظر میں یہی سب سے بڑی بڑائی تھی۔ بقول خود "بیچارے مولوی نے سمجھا ہی نہیں" کے نہ سمجھنے کے ڈر سے چھپاتے بہت تھے۔ سورہ کہف کی تفسیر شائع بھی ہونے دی تو اپنے خاص رنگ وذوق کی چیزوں کو دبا دبا کر ہی زبان قلم تک آنے دیا

۔ کچھ شک نہیں کہ بارہا ان کے ذہن کی تیزی اس راہ میں جتنی دور نکل جاتی وہ خلاف احتیاط ہی نہیں، ایمان وعمل کے لیے خطرناک بھی ہو جاتی تھی۔ خصوصاً عوام کے حق میں، تاہم ان کی ژرف نگاہی اور دوررس ذہن ایسے بہتیرے حقائق کو پالیتا جن پر سلف سے خلف تک شاید ہی کسی مفسر قرآن کی نگاہ پڑی ہو۔ اور یہ "لاتنقضی عجائبه" والی کتاب کے اعجاز کی عین شہادت ہے۔

اس زندہ کتاب کو حضرت مرحوم تفسیری کتابوں سے زیادہ زندگی کی زندہ کتاب اور زندہ واقعات ومشاہدات سے سمجھنے سمجھانے کی کوشش کرتے تھے"۔ (مقدمہ مکاتیب گیلانی، ص ۲۸۔۱۲۷)

خوش طبعی

حضرت مولانا گیلانی کی طبع لطیف نے خوش طبعی سے بھی حصہ پایا تھا۔ ذوق مزاح سے بہرہ اندوز ہوئے تھے۔ متعدد اہل قلم نے جنھیں ان کی تقاریر سننے اور ان کی مجالس میں بیٹھنے کا موقع ملا تھا، ان کی خوش طبعی اور ذوق مزاح کا ذکر کیا ہے۔ مولانا عبدالباری مرحوم لکھتے ہیں:

"مولانا کی زندگی کا ایک اور گوشہ خوش طبعی ومزاح پسندی کا تھا۔ جو کبھی کبھی مزاح کے حدود سے بہت آگے بڑھ جاتی۔ بلکہ اگر کوئی اس ڈھب کا بزِ اخفش ہاتھ لگ جاتا تو اس کو کھلا پلا کر مستقلاً تفریحِ طبع کا تختۂ مشق بنائے رکھتے۔ حیدر آباد کے آخر زمانے میں "بزِ اخفش" کا یہ منصب سالہا سال تک خود اپنی مسجد الحی کے امام کو عطا رہا! یوں بھی کوئی موقع پا جاتے چوکتے ہرگز نہیں۔ ہم دونوں کے ایک اچھے دوست نے کسی تعلیم یافتہ مطلقہ خاتون سے شادی کر لی۔ جو ساتھ کچھ اولاد بھی لائیں۔ وظیفہ یاب ہو کر مولانا وطن میں تھے۔ تاہم یہ خبر پا کر ضبط نہ فرما سکے کچھ اشعار دوسرے کے نام سے موزوں فرما کر تفریحی مبارکباد پہنچا کر رہے"۔ (مقدمہ مکاتیب گیلانی، ص ۴۹)

مولانا عبدالباری مرحوم نے اس مقام پر مولانا مرحوم کے دو شعر بھی نقل کر دیے ہیں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہاں ان کا نقل کرنے سے نقل نہ کرنا زیادہ مناسب ہوگا۔ البتہ ان کی شاعری کے بیان میں نظر آجائیں گے۔

باب سوم

فضائل وکمالات

خطابت

مولانا شیریں بیاں مقرر اور بلند پایہ خطیب بھی تھے۔ ان کی تقاریر کا سب سے اہم موضوع "سیرت نبوی" ہوتا تھا۔ سیرت نبوی کے جلسے اور مولود کی مجالس ان کا میدان تھا۔ یوں تو یہ جلسے ہمیشہ ہی ہوتے رہتے تھے۔ خوشی اور غمی کے ایام ان کے لیے مواقع بہم پہنچاتے تھے۔ لیکن ربیع الاول کا مہینہ تو اس قسم کے جلسوں کا گویا موسم بہار ہوتا تھا۔ حیدر آباد میں نظام اور مسلمان امراء کے دینی ذوق نے ان مجالس کے فروغ میں خاص حصہ لیا تھا۔ ایک مقرر اور خطیب کی حیثیت سے مولانا اس ماحول کی ایک نامور اور مقبول شخصیت تھے۔ جامعۂ عثمانیہ اور اس کے شعبہ دینیات کے تعلق نے ان کی شہرت کو گھر گھر پہنچا دیا تھا۔ ربیع الاول کے مہینے میں ان کی کوئی شب جلسے سے خالی نہیں جاتی تھی۔ ان کی شیریں بیانی اور انداز خطابت نے انھیں ان مجالس کا محبوب مقرر بنا دیا تھا۔ ان کی تقاریر اہل علم کی مجالس سے لے کر عوام کے جلسوں تک یکساں مقبول تھیں۔ پورا شہر ان کی تقاریر کا والہ وشیدا تھا۔ ان کی تقاریر نے مسلمانوں کے عقائد کو درست کیا، اعمال کی اصلاح کی، غلط رسوم ورواج سے تنفر پیدا کیا اور حیدر آباد میں اسلامی زندگی کی ایک لہر دوڑا دی تھی۔ ان کے دوستوں، مصنفوں اور تذکرہ نگاروں نے ان کی تقریر کی روانی، معلومات کی فراوانی اور خوش بیانی کی تعریف اور اس کے اثر ونفوذ کا اعتراف کیا ہے۔ مفتی ظفیر الدین مفتاحی نے اپنی تصنیف "حیات گیلانی" میں مولانا کی خطابت کے تذکرے کے لیے ایک مستقل باب باندھا ہے۔

انجمن اصلاح المسلمین دبیر پور حیدر آباد دکن کے مولوی خیر الدین نے حیدر آباد میں ان کی مقبولیت اور خدمات کے اس ذریعے کے بارے میں لکھا ہے:

> "مسلمانان حیدر آباد کو ابتداء ان کے مواعظ حسنہ نے ان کا گرویدہ بنا لیا۔ پھر ان کی سادہ زندگی اور طلبہ پر شفقت اور بے لوث پر خلوص خدمات نے کلیہ جامعہ اور عوام پر گہرا اثر قائم کیا۔ حیدر آباد کا کوئی بڑا علمی میلاد کا جلسہ ایسا

> نہیں ہوتا تھا جس میں مولانا مرحوم کی موجودگی ضروری اور لازمی نہ سمجھی جاتی ہو۔ حیدر آباد کے میلاد کے بڑے بڑے عظیم الشان جلسے خواہ وہ ربیعین میں ہوں یا رجب، شعبان، رمضان وغیرہ میں ہوں، ان میں ہمیشہ مواعظ ہی ہوتے ہیں اور ان جلسوں میں قرآن وحدیث وسیرت سے استدلال ہوتا ہے، مولانا مرحوم کے مواعظ کو حیدر آباد میں بہت مقبولیت حاصل ہوئی"۔ (صدق جدید لکھنؤ۔ ۱۷ر اگست ۱۹۵۶ء، ص ۶)

مولانا سید صباح الدین عبد الرحمن مرحوم لکھتے ہیں:

> "وہ بڑے شیریں بیان مقرر بھی تھے۔ یہ برابر خبر ملتی تھی کہ حیدر آباد میں عید میلاد النبی کے موقع پر حضور نظام خاص طور پر ان کی تقریر سننے کے لیے شریک ہوتے ہیں۔ وہ اپنی تقریروں میں دلچسپ قصے اور لطیفے بیان کرتے، جن سے سامعین بہت محظوظ ہوتے، ان کو واعظانہ رنگ کے علاوہ تبلیغی، علمی اور کبھی کبھی سیاسی تقریر کرنے میں بڑی قدرت حاصل تھی، وہ اپنی تقریر کی "متین شوخی" سے لوگوں کو ہنساتے تو اپنے عالمانہ استدلال اور عارفانہ نکتہ دری سے ان کو متاثر بھی کرتے تھے"۔

(مولانا مناظر احسن گیلانیؒ (نقوش وتاثرات) معارف اعظم گڑھ مارچ ۱۹۵۷ء ص ۱۸۶)

صحافت

مولانا گیلانی ابھی تعلیم سے فارغ بھی نہیں ہوئے تھے کہ مضمون نگاری کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد ۱۳۳۴ھ (۱۹۱۶ء) میں القاسم والرشید ان کے ہاتھ میں آ گئے تھے۔ ان کے ہر شمارے میں ایک مضمون لازماً اور بعض اوقات کئی کئی مضمون ہوتے تھے۔ ایک عرصے تک ان کی ترتیب وتدوین ان ہی کے ذمے رہی۔ اور قانون وضابطے کے مطابق نہ سہی عملاً وہی ان کے مدیر تھے۔ ادارتی صفحات تک ان کے سمند فکر کی جولان گاہ بنے رہے۔ اصلاح فکر واعمال اور تشریح وتوضیح مسائل میں انھوں نے جو طرز فکر اور اسلوب نگارش اپنایا تھا۔ اس نے اساتذہ کے قلوب میں ان کے فکر وقلم پر اعتماد پیدا کر دیا۔ اساتذہ ان کے ذہن وفکر اور مطالعہ ونظر کے قائل پہلے بھی تھے۔ اب ان کے گرویدہ بھی ہو گئے۔

دار العلوم نکلنا شروع ہوا تو اس کے اولین لکھنے والوں میں مولانا گیلانی کا نام سر فہرست تھا۔ برہان، دہلی، الفرقان، لکھنؤ اور معارف، اعظم گڑھ کے صف اول کے لکھنے والوں میں تھے۔ ہفت روزہ صدق جدید، لکھنؤ اور جامعہ عثمانیہ کے علمی و تعلیمی مجلات میں ان کے بیسیوں بلند پایہ مقالات شائع ہوئے۔ ملک کے دیگر رسائل و جرائد کے صفحات بھی ان کے افادات علمیہ ودینیہ سے خالی نہیں رہے۔ مولانا سید صباح الدین عبد الرحمٰن مرحوم نے لکھا ہے:

"۱۹۴۰ء کے بعد علمی دنیا کی فضا میں ہر طرف چھائے ہوئے تھے۔ معارف، برہان، الفرقان، مجلّہ عثمانیہ، عثمانیہ یونیورسٹی کے اسٹاف میگزین، ندیم، صدق وغیرہ ان کے قلم کی بارش سے سیراب ہو رہے تھے۔ ان کے مضامین کو دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ وہ کبھی عالم، کبھی متکلم، کبھی فقیہ، کبھی محدث، کبھی مفسر اور کبھی مورخ کے رنگا رنگ جلوؤں میں نظر آتے تھے۔"

(مولانا مناظر احسن گیلانی (نقوش و تاثرات) معارف اعظم گڑھ محولہ بالا ص ۱۷۹)

وہ طبقہ علماء میں چند زود نویس اہل قلم میں شمار ہوتے ہیں۔ لیکن زود نویسی ہی مولانا کی خوبی نہ تھی۔ وہ لکھتے بھی بہت اچھا تھے۔ معنی آفرینی، فکر انگیزی اور افکار و معلومات کی فراوانی بھی ان کی تحریروں کی صفات شمار ہوتی ہیں۔

تصوف سے خاص دلچسپی

تصوف کا ذوق ان کے علم و عمل پر چھایا ہوا تھا۔ فلسفہ و کلام کے مطالعے نے ان کی طبیعت کے لیے تصوف کو مانوس اور دینی ذوق نے اسے ان کے معمولات کا ایک حصہ بنا دیا تھا۔ ان کی تحریروں میں تصوف کا ذوق اس طرح جاری نظر آتا ہے جس طرح انسان کی رگوں میں خون گردش کرتا ہے۔ انھیں دیکھنے والے اور ان کی تحریروں کو پڑھنے والے اسے نہ صرف محسوس کرتے ہیں بلکہ اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے۔ تصوف کے علمی و عملی ذوق نے ان کی زندگی میں گفتگو اور بیان و خطابت میں اور تحریروں میں ایک قوی اثر اور سوز و گداز پیدا کر دیا ہے اور خاص تصوف میں ان کی جو تحریریں یادگار ہیں ان کے اثرات و موثرات کا تو پوچھنا ہی کیا۔ ان پر لکھنے والوں نے اور سب ہی نے ان کے ذوق اور زندگی میں اس کے اثرات کا ذکر کیا ہے۔ مولانا دریابادی اپنے مضمون "محقق گیلانی" میں لکھتے ہیں:

"تصوف کے بڑے جاننے والوں میں سے تھے۔ شیخ اکبر محی الدین ابن عربی سے عقیدت خصوصی بھی رکھتے تھے اور مناسبت طبعی و روحانی بھی، باوجود اس کے رسوم خانقاہی اور بدعات مشائخ کے ذرا بھی قائل نہ تھے اور وہم پرستیوں اور ضعیف الاعتقادیوں کے نزدیک بھی نہیں گئے تھے اکبر کی زبان میں:

قائل میں تصوف کا ہوں اکبر لیکن — ارواح پرستی کو تصوف نہیں کہتے

ضابطہ سے بیعت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ سے تھی۔ اور طبیعت پر مذاق توحید تمام تر غالب تھا نماز میں قرآن مجید اس خوش الحانی اور درد و تاثر سے پڑھتے کہ جی چاہتا گھنٹوں اسے سنتے رہیے۔

(صدق جدید، لکھنؤ۔ ۱۵/جون ۱۹۵۶ء، ص ۵)

تصوف کا ذوق مولانا گیلانی کی طبیعت ثانیہ بن گیا تھا۔ انھوں نے تفسیر، حدیث، سیرت، فقہ اور تذکار و سوانح میں مرتب اور غیر مرتب جو ذخیرہ یادگار چھوڑا ہے اس میں ضمناً تصوف کی نہایت مفید بحثیں آئی ہیں اور اشارات و کنایات سے تو ان کی کوئی تحریر خالی نہیں۔ ان کے ذوق تصوف سے ان کی ہر تحریر سیراب ہوئی ہے اور "مقالات احسانی" کا تو پورا مجموعہ ہی تصوف کے زندہ جاوید افکار کا گلدستہ ہے۔

مولانا گیلانی کی وسعتِ مسلک

حضرت گیلانی کے اخلاق و سیرت کے مختلف پہلوؤں پر اس مضمون میں بہت سی باتیں آگئی ہیں۔ لیکن ان کے فکر و سیرت کے جس پہلو کی طرف میں قارئین محترم کی خاص طور پر توجہ دلاؤں گا، وہ ہے ان کا "وسعتِ مسلک"! اگر کسی شخص کے ذوق اور مطالعہ و نظر نے اس کے دل میں کسی فکر و عقیدہ اور طریقۂ عمل کے لیے جگہ بنا دی ہے اور اخلاص نیت کے ساتھ کسی مسلک کو اس کے لیے پسندیدہ بنا دیا ہے تو اس کی دیانت اور اخلاق کا تقاضا ہے کہ اس پر قائم رہے اور دوسرے لوگ اس کی رائے اور پسند کا احترام کریں۔ جو اختیار اور آزادی کوئی شخص اپنے لیے پسند کرتا ہے، وہ اُسے دوسرے کو بھی دینا چاہیے۔ اگر ایک شخص پسند نہیں کرتا کہ اس کے عقیدہ و مسلک میں کوئی دوسرا مداخلت کرے تو اسے بھی دوسرے کے عقیدے اور مسلک میں مداخلت سے باز رہنا چاہیے۔ جب یہ معلوم ہے کہ اصل سر چشمہ

ہدایت اور منبع شریعت کتاب اللہ اور سنت رسول صلعم ہے، انسانی سعادت کی بنا اتباع احکام الٰہی اور اطاعت رسول صلعم ہے نہ کہ کسی غیر معصوم کی محض تقلید! اور فقہی اختلافات حالات گردوپیش اور زمانے کی تبدیلیوں اور انسانی ضرورتوں اور ذوق ورجحان اور اجتہاد علم وفکر نے پیدا کردیے ہیں تو کسی فقہی مسلک اور دائرہ فکر کا ردوانکار اور کسی صاحب مسلک کی توہین وتنقیص اور اس پر تنقید کیسی؟ لیکن ہم انسانی فطرت کی اس خوبی سے انکار نہیں کرسکتے کہ جب ایک انسان کوئی عقیدہ ومسلک ترک یا اختیار کرتا ہے تو اس کی دلی خواہش ہوتی ہے کہ دوسرے لوگ بھی اس کے ترک واختیار میں اس کا ساتھ دیں۔ اس کی یہ خواہش جدل وبحث کا ایک میدان ہموار کردیتی ہے۔ جس کی وجہ سے انسانی زندگی کی بعض ناخوش گواریاں پیدا ہوجاتی ہیں اور اگرچہ مقصد مسرت اور سکون کا حصول ہوتا ہے لیکن سب سے پہلے وہی غارت ہوجاتا ہے۔ قرآن حکیم نے اس انسانی خواہش کی تو نفی نہیں کی لیکن اس کا طریقہ یہ بتلایا ہے کہ یہ جدل وبحث احسن طریقے سے ہونی چاہیے۔ انسان کی یہ آرزو بری نہیں کہ وہ جس عقیدہ ومسلک کو حق سمجھتا ہے، اسکی طرف لوگوں کو بلائے لیکن اسے سمجھ لینا چاہیے کہ وہ صرف دعوت کا مکلف ہے، جبرواکراہ کا مجاز نہیں۔ کسی شخص کو بدل دینا اس کے اختیار کی بات نہیں۔ اگر لوگ اس نکتے کو سمجھ لیں تو ہماری زندگی کے بہت سے اختلافات دور ہوجائیں، ناخوش گواریاں مٹ جائیں اور جن خوشیوں اور مسرتوں سے ہم دور ہوگئے وہ ہمیں مل جائیں۔

حضرت مولانا گیلانی اس معاملے میں بہت وسیع القلب اور فراخ حوصلہ تھے۔ تقشف اور تنگ نظری سے دور ونفور۔ ڈاکٹر غلام محمد مرحوم نے بینات، کراچی میں "تذکرہ احسن" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا۔ اس میں وہ فرماتے ہیں:

"مولانا کے قلب اطہر میں ملت محمدیہ کی محبت اور اس پر شفقت کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ وہ مسلمانوں کی فلاح سے ایسے مسرور ہوتے تھے کہ جیسے خود ان کو کوئی ذاتی فائدہ پہنچ گیا ہو۔ وہ مشرباً پکے حنفی تھے، مگر یہ ان کے جذبہ شفقت کا اثر تھا کہ وہ زبانی بھی اور تحریراً بھی اس بات پر بہت زور دیتے تھے کہ موجودہ حالات میں علمائے کرام کو عام مسلمانوں کے لیے سہولت ہی کا پہلو اختیار کرنا چاہیے۔ خواہ اس میں مسلک حنفیہ کو چھوڑ کر کسی اور مسلک کی اقتدا کیوں نہ کرنی پڑے"۔

اس بیان پر مولانا دریابادی مرحوم نے ان الفاظ میں تبصرہ فرمایا ہے۔ لکھتے ہیں: "اور یہ بات حرف حرف صحیح ہے۔ مولانا باوجود پورے حنفی بلکہ پورے دیوبندی ہونے کے بڑا ہی وسیع مسلک رکھتے تھے اور متقشف بھی نہ تھے۔ فقہا کے کمال احترام وکمال تسلیم کے باوجود ان کے اقوال کو کتاب وسنت کے درجے پر رکھنے کے قائل نہ تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ یہ "احکام نہیں ہیں۔ حکم دینے کا حق تو بس اللہ اور اس کے رسول ہی کو ہے۔ باقی یہ دینی اور شرعی مشورے ہیں اور نہایت اہم مشورے! جیسے طب وغیرہ دوسرے فنون کے ماہرین کے ہوتے ہیں۔

(صدق جدید لکھنؤ، ۲۵/اکتوبر ۱۹۵۷ء ص ۳)

باب چہارم

حضرت مولانا گیلانی کی شاعری

مولانا سید مناظر احسن گیلانی کئی زبانوں میں گہری نظر و عبور رکھتے تھے۔ اردو تو ان کی مادری زبان تھی۔ فارسی اور عربی کی تحصیل مدارس میں کی تھی۔ انگریزی زبان سے بھی کسی قدر واقفیت پید کرلی تھی۔ وہ ہندی سے کسی حد تک آشنا تھے۔ البتہ مگدھی زبان یا جدید بہاری زبان سے بخوبی واقف تھے۔ اور واقفیت محض شدبد کی حد تک نہ تھی۔ ان کی تحریرات میں اس کے الفاظ اور جملے بے تکلفانہ استعمال ہوئے ہیں۔ اور ان کی نعت ان کی واقفیت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ فارسی میں بھی ان کی منظومات یادگار ہیں۔ اردو شاعری سے انھیں ٹونک کے زمانہ طالب علمی میں دلچسپی پیدا ہوئی تھی جو زندگی بھر باقی رہی۔ نظم، نعت، مرثیہ، نوحہ، مثنوی وغیرہ اصناف میں ان کا کلام یادگار ہے۔ متعدد نظمیں اور نعتیں ان کے ذوق شاعری کا ثبوت ہیں۔ بعض نظمیں مگدھی زبان میں یا جیسا کہ انھوں نے خود لکھا ہے کہ دیہات میں بولی جانے والی بہاری زبان میں بھی ہیں، لیکن یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ انھوں نے شاعری سے ایک حد تک ہی تعلق رکھا اگر اس پر توجہ دیتے تو وہ ایک اچھے شاعر بن سکتے تھے۔ اور وقت کے بڑے شاعروں میں ان کا شمار ہوتا۔ وہ اردو فارسی میں ضیاء اور ہندی یا مگدھی میں دھرمی تخلص کرتے تھے۔

شکوۂ خواجہ

یہ مولانا گیلانی مرحوم کی مشہور نظم ہے۔ اور یہی ان کی دریافت شدہ و مطبوعہ پہلی نظم ہے۔ یقین ہے کہ اس سے پہلے بھی انھوں نے کوئی نظم، غزل یا کچھ اشعار کہے ہوں گے لیکن ان کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ یہ نظم ٹونک کے زمانہ طالب علمی کی یادگار ہے۔ ۲۲ر صفر ۱۳۳۱ھ (۲۱ر جنوری ۱۹۱۳ء) کو خواجہ معین الدین چشتی کے مزار پر شاہ جہانی مسجد میں پڑھی گئی تھی۔ نظامی پریس بدایوں میں اسی عنوان سے چھپی تھی اور ٹونک سے مولانا محمد محی الدین ٹونکی نے شائع کی تھی۔ مطبوعہ نظم پر طباعت یا اشاعت کی تاریخیں تو درج نہیں لیکن اس کی آمدنی کے مصرف کے بارے میں اس صراحت نے کہ اس کی آمدنی کی رقم جنگ بلقان کے

مجروحین کی امداد کے لیے وقف تھی اس کا فیصلہ کردیا کہ اس کی اشاعت ۱۹۱۳ء میں عمل میں آچکی تھی نظم پر مولانا کا نام اس طرح درج ہے:

"مولانا سید ضیاء محمد مناظر احسن گیلانوی بہاری"

شکوہ خواجہ "علامہ اقبال کے شکوہ" کے طرز پر اس بحر میں ۲۲ بند پر مشتمل ایک مسدس ہے۔ جس میں مسلمانوں کے نکبت و شکستہ سامانیوں کا اور ہندوستان میں انگریزوں اور ترکی و عالم اسلام پر دول متحدہ کے مظالم کا خواجہ سے شکوہ کیا گیا ہے، خواجہ سے مراد خواجہ عالی مقام حضرت خواجہ معین الدین اجمیری ہیں۔ انھیں سے استدعا کی گئی ہے کہ وہ مسلمانوں کی امداد کے لیے اٹھ کھڑے ہوں:

کشور ہند کے سلطان سے گذارش ہے مری — اسکی سرکار میں کچھ کہنے کی خواہش ہے مری
دل سے فریاد سنے وہ بھی کوشش ہے مری — ایک ہی چھینٹے کی محتاج یہ سوزش ہے مری
آج میں اپنی شکایت کا صلہ پاؤں گا
اپنی بگڑی ہوئی تقدیر بنا لاؤں گا
کیا غریبوں پہ مرے خواجہ نوازش ہے یہی؟ — ہم ستم دیدوں کا کیا پاس گذارش ہے یہی؟
چشت کے ابر کی دنیا میں تراوش ہے یہی؟ — کیا مسلمانوں پہ فیضان کی بارش ہے یہی؟
حیف باشد کہ دریں وقت نہ خیزی آقا!
لختے برحالتِ مالطف ترحم فرما!

اختتام نظم کے قریب ایک بند یہ ہے:

ہم نے مانا کہ بہت عاصی و سرکش ہم ہیں — قدم لعبت مغرب پہ سر اپنے خم ہیں
سالکِ راہ خدا ہم میں بہت ہی کم ہیں — پر کھڑے در پہ تمھارے توبہ چشم نم ہیں
اپنے وابستوں سے یہ چیں بہ جبینی کب تک؟
مرقد پاک میں یہ گوشہ گزینی کب تک؟

نظم میں جوش روانی ہے۔ دل میں درد مند و غم زدہ کے پھپھولے ہیں۔ جو بہہ نکلے ہیں لہجہ پر سوز ہے، جو دل پر اثر کرتا ہے، یہ وقت تھا کہ استعمار دشمنی کے جذبات سے ملک کی فضا معمور تھی۔ خصوصاً مسلمانوں کے دلوں میں انگریزوں کے خلاف نفرت کا لاوا پھوٹ پڑا تھا۔ انگریزوں سے دشمنی اور نفرت و دشمنی کے جذبات نظم کے حروف و سواد سے

ظاہر ہیں۔ "شکوۂ خواجہ" میں ہمیں عقیدہ مذہبی تلاش نہیں کرنا چاہیے۔ ممکن ہے اس وقت کے ماحول اور گردوپیش کے اثرات وافکار کی کوئی جھلک اس میں نظر آجائے لیکن ان کی خاندانی روایت میں اور ان کی بعد کی زندگی میں اس قسم کے افکار کی کوئی پرچھائیں بھی نظر نہیں آتی۔ یہ صرف ایک اسلوب بیان ہے۔ درحقیقت بغاوت کا اعلان اور انقلاب کا درس ہے۔ مولانا گیلانی کے ایک رفیق درس (دیوبند) مولانا عبدالرحمٰن نے لکھا ہے کہ یہ نظم ضبط ہوگئی تھی۔ لیکن کسی اور ماخذ سے اس بیان کی تائید نہیں ہوسکی۔ لیکن ایک دور افتادہ عہد کے خیال پر کسی ایسے بیان کو ترجیح و توفق حاصل ہے، محتاج بیان نہیں۔

چند وضاحتیں

اس نظم کے سلسلے میں مولانا حکیم سید محمود احمد برکاتی مدظلہ نے ازراہ عنایت ہمیں چند وضاحتیں تحریر فرمادی ہیں۔ ملاحظہ ہوں۔ "یہ نظم مولانا گیلانی نے ۱۹۱۲ء ہجری میں اجمیر میں لکھی اور پڑھی تھی۔ مولانا ٹونک میں زیر تعلیم تھے۔ مولانا حکیم سید برکات احمد چند روز کے لیے نواب ٹونک کے ساتھ سفر پر گئے تھے۔ تعلیم کے اس تعطل کے دوران وہ اجمیر گئے تھے۔ وہاں مولانا معین الدین اجمیری کے یہاں قیام کیا۔ اُن کے چھوٹے بھائی غازی محی الدین، مولانا گیلانی کے رفیق درس اور بے تکلف دوست تھے اور ابتدا ہی سے سیاسی مزاج رکھتے تھے اور ملکی وملی سیاسیات میں گہری دلچسپی لیتے تھے۔ ٹونک کے ریاستی ماحول میں سیاست شجر ممنوعہ تھی۔ اس لیے وہ اجمیر منتقل ہوگئے تھے۔ وہی مولانا کی اس نظم کے محرک ہوئے اور انھی نے ایک جلسۂ عام میں مولانا سے یہ نظم سنوائی، جس نے آگ لگادی۔ مسلمان بہت متاثر ہوئے۔ مقامی پولس نے اس جوشیلی اور باغیانہ نظم کا نوٹس لیا اور شاعر کی گرفتاری کے درپے ہوئی۔ احباب نے مولانا کو توفوراً ٹونک واپس روانہ کردیا اور اس نظم میں چند اشعار کا اضافہ کرکے اسے چھپوادیا۔

ہاں اگورنمنٹ کے سائے میں تو اہل اسلام　　چین سے بیٹھے ہیں دن رات بعیش و آرام
روزافزوں ہے شہ جارج کا لطف واکرام　　پھر بھی بے چین بہت ہے یہ ضیاء ناکام
کہ پریشان ہیں یورپ میں ہمارے بھائی
ہدفِ تیرِ ستم ہوتے ہیں پیارے بھائی

مزید اطمینان دلانے کے لیے "جوابِ شکوہ" کی اشاعت کا وعدہ اور اعلان بھی کیا گیا۔

غازی محی الدین صاحب نے متوسطات تک تعلیم حاصل کی تھی اور ذہانت وفطانت کی وجہ سے طلبہ میں نمایاں تھے۔ مگر ان کے سیاسی رجحان نے تکمیل کی نوبت نہیں آنے دی اور وہ میدان سیاست میں کود پڑے اور بڑھتے ہی چلے گئے۔ یہاں تک کہ مولانا شوکت علی انھیں بمبئی لے گئے، جہاں بعد میں وہ آل انڈیا خلافت کمیٹی کے جنرل سکریٹری ہوگئے۔ تقسیم کے بعد وہ پاکستان آگئے اور یہاں سیاست سے ایک لخت کنارہ کش ہوکر خالص علمی مشاغل میں منہمک ہوگئے۔ کئی معرکہ آرا علمی مقالات لکھے جو اقبال ریویو وغیرہ میں شائع ہوئے۔ "اصطلاحات علوم وفنون" کے نام سے ایک عالمانہ کتاب لکھی۔ جو انجمن ترقی اردو پاکستان (کراچی) نے شائع کی۔"

مرثیے

مولانا گیلانی مرحوم نے متعدد شخصیات کی وفات پر، جن سے انھیں عقیدت تھی، مرثیے اور نوحے بھی لکھے ہیں۔ ان کے مرثیے سوزِ غم میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ اپنے دل وجگر کے ٹکڑے انھوں نے صفحہ کاغذ پر بچھادیے ہیں۔ یہ مرحومین جن کے مرثیے انھوں نے لکھے ہیں۔ مولانا محمد علی (۱۹۳۱ء)، علامہ اقبال (۱۹۳۸ء)۔ ابوالمحاسن مولانا محمد سجاد (۱۹۴۰ء) اور علامہ سید سلیمان ندوی (۱۹۵۲ء) ہیں۔ ان مرثیوں میں مرحومین کے سانحات انتقال پر رنج وقلق کے اظہار کے ساتھ ان کے خصائص علم وفکر اور ان کے اخلاق وسیرت کی طرف پرمعنی اشارات اور کنایات بھی کیے ہیں اور خدمات کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ اپنے وطن گیلانی "کی مدح میں مثنوی لکھی اور طبع ہوئی ہے۔

نظمیں

محمد عامر قمر سلمہ نے مجھے حضرت مرحوم کی کئی نظمیں دکھائیں ہیں جو القاسم، دیوبند میں شائع ہوئی تھیں۔ گیارہ اشعار کی ایک نظم "اشک حقیقت" کے عنوان سے ہے۔ اس میں چار اشعار فارسی کے اسی بحروزن میں شامل ہیں۔ (القاسم ربیع الاول ۱۳۳۵ھ) ایک نظم "مضراب" کے عنوان سے جمادی الاولیٰ ۱۳۳۵ھ میں چھپی ہے۔ عنوان کے نیچے خود شاعر کے قلم سے بایں الفاظ صراحت ہے:

"ایک طویل گنگا جمنی (یعنی اردو اور فارسی سے مخلوط) نظم کے چند اشعار"

بارہ اشعار کی اس نظم میں سات شعروں کے پہلے مصرعے فارسی کے ہیں اور تین شعروں کے آدھے آدھے مصرعے اور مکمل جملے فارسی کے ہیں اور خواہ مکمل مصرعے ہوں خواہ مکمل جملے، کمال کی پیوند کاری ہے۔

نعتیں:-

ان کی نظموں میں خیالات کی بلندی ہے۔ زبان کی صفائی ہے، بیان کا زور ہے، اسلوب کی دل کشی ہے، لیکن ان کی شاعری میں خاصے کی چیز نعتیں ہیں۔ میرے سامنے ان کی صرف دو نعتیں ہیں۔ شاید انھوں نے اور بھی کہی ہوں۔

ابھی کسی نے مولانا کا کلام مرتب کر دینے کی طرف توجہ نہیں کی۔ مرتب کلام سامنے ہو، تبھی ان کی شاعری کے بارے میں کوئی قطعی رائے قائم کی جاسکتی ہے۔ بہر حال جو کلام پیش نظر ہے خوب ہے اور نعتیں تو بہت ہی خوب ہیں، میرے سامنے وہی دو نعتیں ہیں جو ڈاکٹر غلام محمد مرحوم نے "مقالات احسانی" میں شامل کرلی ہیں۔

پہلی نعت: یہ نعت ۱۹۲۷ء کی یادگار ہے۔ ہوا یہ تھا کہ مولانا موسم گرما کی تعطیلات میں اپنے وطن "گیلانی" تشریف لے گئے اور وہاں پہنچ کر شدید بیمار پڑ گئے۔ مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحی نے بیماری کی تفصیل بیان کی ہے۔ (حیات گیلانی، صفحہ ۲۳۷) خون پیپ بن کر بہنے لگا۔ کئی آپریشن ہوئے صحت نہ ملی۔ پھر ایک نئے آپریشن کی تیاری تھی مولانا نے "بارگاہِ رسالت میں التجا والتماس" کی۔ التجا قبول ہوئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم (فداہ ابی وامی) نے اپنے دیدار سے مشرف فرمایا۔ مرض جاتا رہا۔ آپریشن کی ضرورت ہی باقی نہ رہی۔

خود مولانا فرماتے ہیں:

"صبح ہوئی عجیب صبح تھی! ڈاکٹر آئے... متحیر ہو کر پوچھ رہے تھے، پھوڑا کہاں تھا؟ آخر اس فیصلے پر مجبور ہوئے کہ اب آٹھویں آپریشن کی ضرورت نہیں رہی! کیوں باقی نہیں رہی؟ یہ ایک راز تھا۔ بس سیہ کار پر نظر رحمت پڑ چکی تھی۔"

صاحب حیات گیلانی نے اس راز سے پردہ ہٹا دیا ہے "راز یہ تھا کہ اس رات میں غالباً

سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت حصے میں آئی"۔ صحت بحال ہو گئی۔ مولانا حیدر آباد روانہ ہو گئے۔ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس نعت میں ان کی التجا والتماس میں کتنا سوز دروں اور غم پنہاں اور جذب و شوق کا کیا عالم ہو گا۔ جو قبولیت کا یہ مقام پایا۔ اس کی زبان بہار کے دیہات کی بول چال کی زبان ہے۔ مولانا نے اسے مگدھی یا بہاری زبان لکھا ہے۔ بعض مصرعے صاف اردو میں ہیں۔

مولانا کی نعت ملاحظہ کیجیے۔ اس کی زبان سے لطف اندوز ہو جیے، ایمان تازہ کیجیے۔ اور ذوق لسانی وادبی کو تسکین اور جذبہ ایمان کی پرورش کیجیے۔ اللہ کی یہ بڑی نعمت ہے کہ انسان کو قلب کا اطمینان اور روح کی تسکین میسر آجائے۔ اس نعت کا عنوان اور اس پر نوٹ مولانا گیلانی مرحوم کے قلم سے ہے۔ مطالعہ فرمائیے:

بارگاہِ رسالت میں التجا والتماس

"ہر ہر عضو گرا ہوا تھا، چلنا پھرنا تو دور کی بات ہے، قسم ہے اس خدائے زندہ و توانا کی، جو مردوں سے زندوں کو اور زندوں کو مردوں سے نکالتا ہے کہ ایک سکنڈ دو سکنڈ کے لیے بھی بیٹھنے کی آرزو جس سیاہ بخت کے لیے مہینوں سے صرف آرزو بنی ہوئی تھی، بخت کی بیداری کے بعد دیکھا جارہا تھا، کہ اب وہ اٹھ رہا ہے، اٹھتا چلا جارہا ہے، جس کی موت کا فیصلہ کیا جاچکا تھا۔ وہ دوبارہ گویا زندوں میں پھر شریک کر دیا گیا۔ ہسپتال والوں نے چند ہی دنوں بعد حکم دے دیا کہ اب یہاں رہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ حکم کی تعمیل کی گئی۔ پھر آگے کیا قصے پیش آئے ان کی تفصیل غیر ضروری ہے۔ شعور اور احساس میں ایک خیال کے سوا دوسرا خیال یا ایک جذبہ کے سوا دوسرا کوئی جذبہ باقی نہ رہا تھا۔ اس زمانے میں بہار میں تھا۔ بہار کی دیسی آبادی جو دیہاتوں میں رہتی ہے ایک خاص قسم کی زبان بولتی ہے اس زبان میں اور کچھ ہو یا نہ ہو، لیکن التجا والتماس کے لیے اس کا پیرایہ حد سے زیادہ موزوں اور مناسب ہے، بے ساختہ اسی زبان میں کچھ مصرعے ابلنے لگے، سن کر تو اردو زبان کے سمجھنے والے بھی اس کو شاید سمجھ سکتے ہیں۔ لیکن اردو زبان کے املا کے حدود میں

مگدھی یا بہاری زبان مروجہ کے ان الفاظ کو لانا دشوار ہے۔ کتابی شکل میں صحیح طور پر جیسا کہ چاہیے شاید وہ سمجھے بھی نہیں جا سکتے لیکن عرض چوں کہ اسی زبان میں کیا گیا تھا۔ بجنسہ ان ہی الفاظ کو (نیچے) نقل کر دیتا ہوں۔ ''درشن'' کی آرزو اس عجیب و غریب اضطراری نظم کی روح تھی، بہار کے نائب امیر شریعت مولانا سجاد مرحوم اگرچہ بہ ظاہر فقیہ النفس والصورت تھے۔ مگر ذاتی تجربے کے بعد یہ ماننا پڑتا تھا کہ باطن ان کا فقیہ سے زیادہ فقیر تھا۔ قرابت کے تعلقات کی وجہ سے گیلانی بھی کبھی تشریف لائے تھے اسی زمانے میں اتفاقاً ان کی تشریف آوری ہوئی، اس نظم کے سننے کا موقع ان کو بھی ملا، سنتے جاتے تھے اور روتے جاتے تھے، خصوصیت کے ساتھ اس بند پر تڑپ تڑپ گئے، ہچکیاں ان کی بندھ گئیں، یعنی دوسرا بند!

تمری دواریا کیسے چھوڑوں — تم سے توڑوں تو کس سے جوڑوں
تمری گلی کی دھول بٹوروں — تم رے نگر میں دم بھی توڑوں
جی کا اب ارمان یہی ہے
اٹھوں پہر اب دھیان یہی ہے

''تم سے توڑوں تو کس سے جوڑوں'' اس استفہامی مصرعے کو بار بار دہراتے اور بے قرار ہو ہو کر بلبلاتے، اور ہے بھی یہ سوال کچھ اس قسم کا، آج انسانیت زمین کے اس خاکی کرّے پر تڑپ رہی ہے۔ زندگی کا مطلب کیا ہے؟ اس سوال کو حل کرنا چاہتی ہے۔ ایک اس سوال کے جواب کی صحیح توقع کی جائے؟ اس تنہا واحد آستانے سے ٹوٹنے والا خود سوچے کہ کہاں جائے گا۔ کن کے پاس جائے گا۔ موسیٰ ہوں یا عیسیٰ، ابراہیم ہوں، یا یعقوب علیہم السلام یا ان کے سوا کوئی اور اس راہ کے ان سب راہبروں نے اپنے اپنے وقتوں میں جو راہ پیش کی تھی، جب وہ ساری راہیں مسدود ہو چکی ہیں، تاریخ جانتی ہے کہ ڈھونڈھنے والوں کو ان بزرگوں کی بتائی ہوئی راہ نہیں مل سکتی، تو اب دنیا کہاں جائے۔ اور اس کے سوا کہ:

جلوہ ات تعبیر خواب زندگی (اقبالؒ) کا فیصلہ کرتے ہوئے ''تم سے توڑوں تو کس سے جوڑوں'' کہتا ہوا اسی چوکھٹ کے ساتھ چمٹ جائے، جس کے سوا شاہبات والوں کو غیب

تک پہنچنے اور پہنچانے کا کوئی دوسرا ذریعہ باقی نہیں ہے۔

(مناظر احسن گیلانی)

پیارے محمدؐ جگ کے سجن — تم پرواروں تن من دھن
تمری صورتیا من موہن — کبھو کرا ہو(۱) تو درشن
جیا کُھڑے ڈلوا(۲) ترسے
کرپا کے بدرا(۳) کہیا(۴) برسے
تمری دواریا کیسے چھوڑوں — تم سے توڑوں تو کس سے جوڑوں
تمری گلی کی دھول بٹوروں — تمرے نگر میں دم بھی توڑوں
جی کا اب ارمان یہی ہے
اٹھوں پہر دھیان یہی ہے
صلی اللہ علیک نبیا — تمرے دوارے آیا دکھیا
بھنیا(۵) اکی پکڑھو راجا — اپنے حسین وحسن کا صدقا
ڈھوا(۶) گھریں ناؤ کو اس کے
اب نہیں ہم ہیں اپنے بس کے
سیس پہ اکے پاواں(۷) دھر ہو — پیت کی اگیا من میں بھر ہو
بھدر(۸) ہوا پہ تنی(۹) کرپا کر ہو(۱۰) — سپنو میں ایسن(۱۱) کر گجر ھو(۱۲)
راجا تمری دیوڑھی بڑی ہے
رحمت تمرے نام پڑی ہے
اندھرا(۱۳) کے تم رہیا بتا ہو(۱۴) — ہردے(۱۵) کا اکے جوت جگا ہو
ڈگری(۱۶) پہ اپنے اکو چلا ہو — بودھا(۱۷) کے تم بدھی(۱۸) بنا ہو
کھینچو اکو پاپ نرکھ سے
دھودیہو کالیکھ(۱۹) منہ کا اکے

(۱)- کبھی کر دیجیے، (۲)- کڑھتا ہے دل، (۳)- بادل، (۴)- کب، (۵)- بازو، (۶)- موجِ عظیم، (۷)- پاؤں، (۸)- حد درجہ بدبخت، (۹)- ذرہ، (۱۰)- مہربانی، (۱۱)- کیجیے، (۱۲)- کر گزریئے، (۱۴)- قوی باطنی، (۱۵)- راستہ، (۱۶)- بیوقوف کو، (۱۷)- دانش مند بنا دیجیے، (۱۸)- سیاسی، (۱۹)- بھٹک بھٹک۔

تمرے پیا کی اونچی اٹریا   ہمری نے ہی واں پہ گجریا
پکھلئی(۲) ہے اک تمری دواریا   بتلا بتلا رہی نجریا(۱)

ان کھر(۳) پتوا(۴) تمرے سے چلی ہے
کھوجوا(۵) بھی اُن کا تمرے سے ملی ہے

پی کی پتیا(۶) تم ہی لے لہو   ان کھر بتیا(۷) تم ہی سنی لہو
ہمنی کے نندیا سے تم جگے لہو(۸)   مرل تھلبئی ہم جلے(۹) لہو

دھرمی(۱۰) بھے لو ں تم ری(۱۱) دیا سے
مکتی(۱۲) بھی ہوای ہی تمری دووا(۱۳) سے

تمری دواریا کیسے چھوڑوں   تم سے توڑوں تو کس سے جوڑوں
تمری گلی کی دھول بٹوروں   تمرے نگر میں دم بھی توڑوں

جی کا اب ارمان یہی ہے
اٹھوں پہر اب دھیان یہی ہے

دوسری نعت: ۱۹۲۸ء میں مولانا گیلانی کو حج کی سعادت نصیب ہوئی تھی۔ دوسری نعت اس مبارک سفر کی یادگار ہے۔ اس کا عنوان ہے:

"عرض احسن۔۔۔ بہ آستانہ نبوت کبری، علی صاحبہا الصلوۃ والسلام" یہ ایک طویل نعت ہے اور فارسی زبان میں ہے۔ کئی شعر عربی میں اور کئی عربی فارسی میں ملے جلے ہیں۔ یہ نعت نظم، غزل، مربع، مخمس، مسدس۔۔۔ کس ہیئت میں ہے اس کا فیصلہ قارئین کرام خود کر سکتے ہیں۔ مکمل نعت تو ضمیمہ کلام میں ملاحظہ ہو۔ لیکن اس کے چند ٹکڑے یا بند نقل کیے جاتے ہیں:

ہر ایک سے ٹکرا کر ہر شغل سے گھبرا کر   ہر فعل سے شرما کر ہر کام سے پچتا کر
آمد بدرت بنگر

---

(۱)۔ نظر، (۲)۔ دیکھی ہوئی ہے، (۳)۔ ان کا، (۴)۔ پتہ، (۵)۔ سراغ، (۶)۔ خط، (۷)۔ باتیں، (۸)۔ جگایا، (۹)۔ مرے ہوئے تھے، (۱۰)۔ مومن ہوئے، (۱۱)۔ مہربانی سے، (۱۲)۔ نجات بھی ہوئی، (۱۳)۔ آپ کی دعا سے۔

اے خاتم پیغمبر یا قاسم الکوثر   اے سرور ہر سرور اے رہبر ہر رہبر
اے آں کہ توئی افسر ہر کہتر و ہر مہتر   فی المبداء والمحشر اے ہستی تو محور
للاکبر و الاصغر اے طلعت تو مظہر   للاول والآخر اے رحم جہاں پرور
آقائے کرم گستر   آمد بدرت بنگر

نے ساز نہ سامانے، نے علم نہ عرفانے   نے دین نہ ایمانے، نے فضل نہ احسانے
از خانہ ویرانے، وز کلبہ احزانے   وز محبس وزندانے، ناشکری وکفرانے
آمد بدرت بنگر   کالحائر والمضطر

ہاں دستِ دعا بکشا از ذرہ اوادنیٰ   وز قبہ ما اوحیٰ اے مرضی تو ترضیٰ
اے ملت تو بیضا فالیل لقد یغشیٰ   والکفر قد استعلیٰ ذالمتک الضعفیٰ
فی سَیطرۃِ الْاعداء   ہاں سَہمكَ لَایَطْفیٰ
ورمیتك لایخفیٰ
وَاللہ ھُوَالاَعْلیٰ   والحقُّ فَلا یُعْلیٰ

باب پنجم

تصنیفات و تالیفات

مولانا گیلانی نے اپنے پیچھے تصنیفات و تالیفات کا جو یادگار ذخیرہ چھوڑا ہے۔ وہ کیفیت وکمیت ہر دو اعتبار سے نہایت قیمتی ہے۔ انھوں نے معقولات، منقولات، تذکار وسوانح، تاریخ، تعلیم، اخلاق وغیرہ بے شمار موضوعات پر لکھا ہے۔ اور اگر کسی علم وفن میں ان کا کوئی مستقل مختصر یا طویل مقالہ نہ ملے تب بھی کسی تصنیف یا تذکرے میں کوئی مختصر اور ضمنی بحث اس پر ضرور مل جائے گی۔ مذہب اور اسلامی علوم میں قرآن، تفسیر، حدیث، اصولِ حدیث، فقہ، اصولِ فقہ نیز الٰہیات، فلسفہ وحکمت، منطق، کلام، تصوف اور پھر اس میں ایرانی ہندوستانی اور اسلامی یا اطلاقی تصوف جسے شاہ ولی اللہ نے "احسان" سے تعبیر کیا ہے۔ فلسفہ اور اس کی مختلف شاخیں، ان کے اصول وفروع، تاریخ ہند وایران، تاریخ اسلام، تعلیم، اس کی تاریخ وفلسفہ اور نظام ونصاب تعلیم، غرض کہاں تک کوئی ان کے موضوعات گنوائے۔ اگر تھوڑے تھوڑے فرق کا لحاظ کر کے شمار کیا جائے تو ان کی تعداد سیکڑوں تک پہنچ جائے گی۔ مولانا کی تصنیفات و تالیفات اردو زبان وادب کا بیش قیمت سرمایہ ہیں۔

یہ عجیب بات ہے کہ انھوں نے اپنی کسی کتاب کو تصنیفی اصول وطریق اور منصوبہ بندی کے تحت نہیں لکھا۔ میرا منشا یہ ہے کہ انھوں نے اپنی کسی تصنیف کے لیے پہلے سے کوئی منصوبہ بندی کی، نہ اس کیلیے کوئی خاکہ بنایا اور نہ اس کا کوئی دائرہ بحث ونظر متعین کیا۔ ان کی اکثر تصانیف ان کے اپنے منتخب موضوع اور فیصلہ علمی کا نتیجہ بھی نہیں۔ عام طور ہمیشہ یہی ہوا کہ کسی نہ کسی موضوع پر مقالے کا تقاضا کیا یا کسی تحریک وفکر یا کسی بحث ونظر سے مولانا کے جذبات اور ذوق دینی کو انگیخت کیا اور مولانا نے قلم اٹھا کر لکھنا شروع کر دیا۔ مضمون پھیلتا گیا، موضوع کے مختلف علمی پہلو اور فکر ونظر کے گوشے سامنے آتے گئے مولانا اپنے افکار ومعلومات کے موتی بکھیرتے رہے۔ تا آں کہ کسی واقعے نے ان کی توجہ کو اس طرف سے ہٹا نہ دیا ہو یا بیماری اور صحت کے کسی عذر نے قلم کو روک دینے پر مجبور نہ کر دیا ہو۔ مولانا کے بیشتر مقالات کی محرک تحریر کوئی ایسی ہی بات ہوئی اور اسی سلسلۂ مضامین اور افکار ومباحث

نے ایک نئی تصنیف کی شکل اختیار کرلی۔ مولانا کو اپنی تصنیفی کیفیت کا خود بھی احساس تھا۔ خود فرماتے ہیں:

"ایک دفعہ جھونک میں لکھنے بیٹھا تو لکھتا چلا گیا۔ اب پھر اس پر نظر ثانی حک واصلاح میرے لیے مشکل ہے"۔ (معارف اعظم گڑھ، مارچ ۱۹۶۳ء ص ۲۳۲-۲۳۱)

مولانا سید سلیمان ندویؒ کے نام ایک خط میں اپنے طریقہ تحریر کے بارے میں لکھتے ہیں:

"...لکھنے کے لیے فقیر نے اب تک کچھ نہیں لکھا ہے۔ جو کچھ بھی ہو جاتا ہے کوئی سر پر سوار ہو کر لکھوا لیتا ہے یا اسی قسم کی کچھ مجبوریاں پیش آجاتی ہیں"۔

(معارف، اعظم گڑھ، اپریل ۱۹۶۳ء ص ۲۹۷)

مولانا کے شاگرد ڈاکٹر غلام محمد مرحوم لکھتے ہیں:

"مولانا فرماتے تھے کہ ان کی کوئی تصنیف بھی باضابطہ "تصنیفی پروگرام" کے تحت انجام نہیں پائی۔ یہی ہوتا رہا کہ کسی نے کسی مضمون کی فرمائش کی۔ مولانا لکھنے بیٹھ گئے۔ جب لکھ چکے تو وہ مضمون نہ رہا بلکہ کتاب تیار ہو گئی۔... دوسری صورت یہ ہوتی رہی کہ کالج کے لیکچر کی تیاری یا ایم۔اے اور پی۔ایچ۔ڈی کے طلبہ کے مقالات کی رہبری کے سلسلے میں مختلف موضوعات پر جو معلومات فراہم کرنا پڑتی وہ اتنی زیادہ قیمتی تھیں کہ ہر موضوع کی ایک مستقل کتاب خود بخود تیار ہو گئی"۔ (مقالاتِ احسانی، ص ۱۲)

حضرت مولانا گیلانی کی تحریرات ونگارشات کا جو ذخیرہ تصنیفات وتالیفات کی شکل میں مرتب ہو چکا ہے۔ ان میں سے چند یہ ہیں، جن تک دستِ شوق کی رسائی ہوئی ہے یا کم از کم علم میں آچکی ہیں:

۱۔ سیرت: النبی الخاتم (صلی اللہ علیہ وسلم) ظہورِ نور یا نیا میلاد نامہ

۲۔ تذکار وسوانح: ابوذر غفاری، امام ابو حنیفہ کی سیاسی زندگی، مجدد الف ثانی۔ تذکرہ شاہ ولی اللہ، سوانح قاسمی (سہ جلد)، سیرت بانی دار العلوم، بابا رتن ہندی۔

۳۔ تفسیر اور حدیث وفقہ: تدوین قرآن، تذکیر بسورۃ الکہف، تدوین حدیث، مقدمہ تدوین فقہ۔

۴۔ دین اور اخلاق وتصوف: الدین القیم، مقالات احسانی، مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کا افسانہ، کائناتِ روحانی۔

۵۔ تعلیم: مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت، میرا مجوزہ تعلیمی خاکہ۔
۶۔ علوم وافکارِ اسلامی: اسلامی معاشیات، اسلام اور نظام جاگیرداری وزمینداری۔
۷۔ خودنوشت: احاطہ دارالعلوم میں بیتے ہوئے دن۔
۸۔ خطوط: مکاتیب گیلانی مرتبہ مولانا منت اللہ رحمانی، ۱۹۷۲ء مونگیر (بہار)
۹۔ دیگر: ہزار سال پہلے، مضامین گیلانی، افادات گیلانی (الفرقان کا خاص نمبر)
۱۰۔ تراجم: صدرالدین شیرازی کی مشہور کتاب "اسفار اربعہ" کا ترجمہ۔ اس ترجمے کے صفحات کی تعداد ۱۷۵۷ ہے۔ مولانا اس کے شریک مترجم ہیں پورا ترجمہ ان کی کاوش کا نتیجہ نہیں۔ دارالترجمہ حیدرآباد سے شائع ہوا ہے۔ مولانا نے شاہ اسماعیل شہید کی تصنیف "طبقات" کا اردو ترجمہ بھی کیا تھا جو حیدرآباد اور لاہور سے چھپ چکا ہے۔

ان کے علاوہ کئی مضامین کتابچوں کی شکل میں نظر سے گذرے ہیں۔ مولانا گیلانی اور ان کی تصنیفات کے بارے میں محترم عتیق الرحمٰن سنبھلی نے لکھا ہے۔

> مرحوم اپنے وقت کے فرد فرید اور اپنی بعض خصوصیات کے تو بظاہر خاتم تھے۔ ان کا علم ہمہ جہت تھا اور قلم ہردم رواں دواں۔ چنانچہ ان کے قلم سے اسلامی لٹریچر میں جو گراں قدر اضافہ ہوا ہے ممکن نہیں کہ اسے نظر انداز کیا جا سکے۔ ابوذر غفاری، النبی الخاتم، الدین القیم، اسلامی معاشیات، مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت، امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی اور تدوین حدیث ان کی ایسی تصنیفات ہیں جن سے مدتوں علم وتحقیق کے چراغ روشن ہوتے رہیں گے۔
>
> (الفرقان، افادات گیلانی نمبر، ص ۵)

میں نے کوشش کی ہے کہ مولانا کی تصنیفات وتالیفات، علوم وفنون کے چند دائروں میں مرتب کر دی جائیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مولانا کی کوئی تصنیف اپنے موضوع اور فن کے دائرے میں کہاں رہی ہے۔ کسی ایک فن کی بحث چھیڑتے ہیں، پھر بحث جوں جوں بڑھتی اور پھیلتی ہے، مختلف علوم وفنون کی بحثیں اس میں شامل ہوتی جاتی ہیں۔ اور مولانا اصل

اور ضمنی اور متعلق اور غیر متعلق افکار ومباحث کے ذخیرہ فراہم کر دیتے ہیں۔ ان کی کوئی تصنیف تفسیر، حدیث، فقہ، تعلیم، سیرت، سوانح، جن کا موضوع اور فن قطعی واضح اور متعین ہو اٹھا کر دیکھ لیجیے نہ صرف یہ تمام موضوعات اور فنون ایک دوسرے میں گڈمڈ نظر آئیں گے بلکہ الٰہیات، فلسفہ، کلام ان کے اصول، اقسام، مکاتبِ فکر، ان کے خصائص، اختلافات کے مباحث اس طرح ایک دوسرے میں پیوستہ ملیں گے کہ انھیں ایک دوسرے سے الگ کرنا مشکل ہوگا۔

مولانا گیلانی کی وہ تحریرات جو کسی کتاب یا مجموعہ مضامین ومقالات کی شکل میں چھپ چکی ہیں۔ وہ بذاتہ کوئی معمولی ذخیرہ علمی نہیں۔ کسی شخصیت کی بیش قیمت علمی خدمات کے تذکرے میں بہت بڑا سرمایہ علوم ومعارف ہے۔ جو اس کی عظمت اور حیات جاوید نیم اسلامی علوم وفنون اور دعوت واصلاح کی تاریخ کا یادگار سرمایہ ہے۔ لیکن ایک بہت بڑا ذخیرہ وہ ہے جو جرائد ورسائل میں اب تک مدفون اور کسی صاحب ہمت محقق کے اقدام وسعی اور کسی علمی ادارے کے وسائل کے انتظار میں ہے۔ اور مصنف "حیات مولانا گیلانی" کے مطابق متعدد مسودات موجود ہیں جو ابھی تک شائع نہیں ہوئے۔

قرآنیات

قرآن حکیم سے مولانا گیلانی کو خاص لگاؤ تھا۔ قرآن کی تلاوت اس کی آیات وسور پر غور وفکر وتدبر اور اپنی مجلسوں اور تقریروں میں افکار ومعلومات کے موتی بکھیرتے تھے۔ قرآن حکیم کے جمع وتدوین سے لیکر اس کے افکار وتعلیمات اور مسائل وتفسیر تک مختلف پہلوؤں پر بہت مقالات لکھے۔ ان میں سے بعض تو مستقل کتابیں بن گئیں اور بہت سے مقالات رسائل کے صفحات میں دبے اور چھپے ہوئے ہیں۔ قرآنی آیات سے مطالب کے استخراج اور مسائل کے استنباط میں ان کا ذہن خوب چلتا تھا۔ کئی اہل قلم نے ان کی اس خوبی کا ذکر کیا ہے۔ اگر وہ سنجیدگی کے ساتھ تفسیر پر توجہ فرماتے اور اپنے افکار ومعلومات کو مرتب فرما دیتے تو ایک تفسیر میں وہ ایک خاص دبستان فکر کے بانی قرار پاتے۔ مولانا عبدالباری ندوی مرحوم کو ان کی اس خوبیٔ ذہن، انداز فکر اور خاص اپروچ کا اندازہ تھا اس لیے انھوں نے بار بار توجہ دلائی لیکن مولانا اس پر بعض خاص وجہ سے ملتفت نہ ہوئے۔ مولانا عبدالباری ندوی

لکھتے ہیں۔

"میں مولانا سے ہمیشہ اور ہمیشہ سے زیادہ وظیفے پر سبکدوشی کی فرصت وفراغت کے دنوں میں بار بار درخواست کرتا رہا کہ اب ہر طرف سے یک سو ہو کر اپنی ان خاص "قرآنی یافتوں" ہی کو جمع وتدوین فرمادیں، مگر کتراتے ہی رہے۔ بڑی وجہ بظاہر وہی "بے چارے مولویوں" کی ناراضی کا ڈر کہ تفسیری دفتروں کے خلاف بعض باتوں پر خدا جانے کتنا شور وشغب اٹھ کھڑا ہو"

(مقدمہ مکاتیب گیلانی، ص ۳۶-۳۵)

اس مقدمے میں اس مقام کے بعد لکھتے ہیں:

"اس بے علم کی نظر میں مولانا کے فکری اور علمی کمالات کا وقت کے لیے سب سے کار آمد یادگار کارنامہ خصوصاً جدید ذہنوں یا نئی تعلیم والوں کے حق میں ان کی "قرآنی یافتوں" کا ذخیرہ ہوتا۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ سورہ کہف کے سوا قصداً انھوں نے اہتمام فرمایا کہ اس سلسلے کی کوئی اور مستقل چیز منظر عام پر نہ آنے پائے"۔ (ص۔ ۳۷)

تذکیر بسورۃ الکہف میں مولانا کی قرآنی خصوصیات یا بہ قول مولانا عبدالباری ندوی کے ان کی خاص "قرآنی یافتوں" کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ انہیں خود بھی اپنے طرز فکر اور تفسیر کی اس خصوصیت کا احساس تھا اور انھوں نے اپنی تحریروں میں جہاں کسی آیت کے مفہوم واطلاق کی بحث آتی ہے اور بعض خطوط میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ لیکن انھوں نے نہ تو تفکر وتدبر کے مزید قدم اس راہ میں بڑھائے اور نہ ان کی تالیف وتدوین کی طرف توجہ فرمائی۔

قرآنیات میں مولانا کے متعدد مقالات ہیں۔ یہ مقالات تفسیر کی عام روایت اور اصول وانداز کے مطابق تالیف نہیں کیے گئے ہیں۔ لیکن ہر مقالے یا سلسلۂ مقالات کا ایک خاص پس منظر ہے۔ جب کسی واقعے، کسی مطالعے یا کسی غور وفکر یا مکالمہ ودرس کے دوران میں کسی خاص نکتے نے خیالات کو تحریک دی مولانا کا قلم رواں ہوا اور معلومات وافکار اور علمی نکات کا ایک انبار جمع ہو گیا۔ قرآنیات کے خاص دائرے میں یا کسی حد تک تفسیری مباحث کا احاطہ کرنے والے مقالات جو میرے علم میں آئے ہیں اور ان میں سے بعض کتابی شکل میں

بھی چھپ گئے ہیں، یہ ہیں:

۱۔ تذکیر بسورۃ الکہف: اولاً یہ مقالہ الفرقان (لکھنؤ) کی ذی الحجہ ۱۳۶۸ھ سے جمادی الآخری ۱۳۷۱ھ (اکتوبر ۱۹۴۹ء تا مارچ ۱۹۵۲ء) تک دجالی فتنہ اور سورہ کہف" کے عنوان سے اکیس قسطوں اور دو سو ساٹھ صفحوں میں پھیلا ہوا ہے۔ دوبارہ مولانا کے انتقال کے بعد کچھ ترمیمات ودرستگی کے بعد اسی رسالے کے "افادات گیلانی نمبر" میں شامل کیا گیا۔ بعد میں حیدر آباد دکن سے کتابی صورت میں شائع ہوا۔

"مولانا عتیق الرحمن سنبھلی نے لکھا ہے کہ مولانا نے اس مضمون میں سورۂ کہف کی تفسیر ایک نئے انداز سے کی ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ اس سورت پر انھوں نے ایک خاص نقطۂ نظر سے مدتوں غور کیا تھا... حقیقت یہ ہے کہ یہ مضمون تدبر قرآن کی ایک نئی راہ کھولتا ہے۔" (الفرقان، افادات گیلانی نمبر، ص ۱۳)

۲۔ ادب قرآنی:۔ یہ ایک مختصر سی کتاب ہے۔ اس کا مطالعہ قرآن مجید کا ترجمہ سمجھنے میں سہولت پیدا کر دیتا ہے۔

(مقالہ ڈاکٹر پروفیسر اختر راہی۔ مطبوعہ المعارف، لاہور ستمبر ۱۹۸۰ء ص ۲۹-۲۸)

۳۔ تدوین قرآن:۔ پروفیسر محمد اجمل خاں کے بعض خیالات کے رد میں پہلی بار یہ کتاب ۱۹۷۶ء میں کراچی سے شائع ہوئی۔

متفرق وغیر مرتب قرآنی مقالات

(۱) قرآن کے صائبین کیا بدھ مذہب کے ماننے والے تھے؟ مولانا گیلانی کا یہ مقالہ معارف اعظم گڑھ کے فروری ومارچ ۱۹۵۳ء (جلد ۷۱، شمارہ ۲ و ۳) میں شائع ہوا تھا۔

(۲) اسلام اور ہندو مذہب کی بعض مشترک تعلیمات:۔ یہ مقالہ بھی اولاً معارف میں (اپریل ۱۹۵۲ء، جلد ۶۹، شمارہ ۴) میں چھپا تھا۔ ۱۹۷۸ء میں خدا بخش لائبریری پٹنہ سے کتابچے کی صورت میں چھپ گیا ہے۔

(۳) تورات کے دس احکام اور قرآن کے دس احکام:۔ یہ مقالہ برہان دہلی (مارچ تا جون ۱۹۵۱ء، جلد ۲۶ شمارہ ۳ تا ۶ اور ستمبر تا دسمبر ۱۹۵۱ء جلد ۲۷ شمارہ ۳ تا ۶) میں آٹھ قسطوں میں شائع ہوا تھا۔ میرے علم میں اس کی کتابی صورت میں اشاعت نہیں ہوئی۔

(۴) روزہ اور قرآن: یہ مقالہ الفرقان لکھنؤ میں (شعبان ۱۳۷۱ھ) میں شائع ہوا تھا۔

(۵) الجنۃ والنار اور نشاۃ روحانیہ (ضمیمہ الجنۃ والنار) کے عنوان سے القاسم، دیوبند (ذی قعدہ ۱۳۴۴ھ تا محرم ۱۳۴۷ھ) میں چھ قسطوں میں چھپا تھا اس کے بیشتر مباحث واستدلالات کا تعلق قران حکیم ہی سے ہے۔ "جنت وجہنم" کے عنوان سے ایک مضمون الفرقان، لکھنؤ (بابت جمادی الآخر ۱۳۵۶ھ) میں ملتا ہے اس کا تعلق بھی اسی دائرہ سے ہے۔

قرآنیات ہی کے ضمن میں ان مضامین کا ذکر بھی اس مقام پر کر دینا چاہیے۔

(۱) سورۂ یوسف سے سبق	صدق جدید، لکھنؤ	۲۵/ مئی ۱۹۵۱ء
(۲) تعلیم اشاعت قرآن	صدق، لکھنؤ	۱۶/ نومبر ۱۹۴۲ء
(۳) قرآن اور قارون	صدق، لکھنؤ	۲۷/ دسمبر ۱۹۴۳ء
(۴) توحید القرآن		
(۵) فصل لربک وانحر	القاسم، دیوبند	ذی الحجہ ۱۳۴۴ھ
(۶) الشہب القرآن	"	"
(۷) ضرورۃ القرآن	"	"
(۸) اعجاز القرآن	"	"
(۹) قرآن کے طرز استدلال پر ایک سرسری نظر	"	"
(۱۰) حج ابراہیمی اور نمرودی مغالطہ	برہان، دہلی	مئی ۱۹۴۶ء
(۱۱) تاریخ ارض القرآن (از سید سلیمان ندوی) تبصرہ	معارف اعظم گڑھ	مئی ۱۹۵۵ء

سیرت نبوی

(۱) النبی الخاتم: ایک مضمون تھا جو "ایمان" (پٹی، ضلع امرتسر) کے لیے لکھا گیا تھا اور اولاً اسی میں چھپا تھا۔ بعد میں بعض ترامیم واصلاحات کے بعد کتابی شکل میں چھپا۔ یہ سیرت

النبی میں مولانا گیلانی کی مشہور مقبول تصنیف ہے۔ اب تک اس کے ان گنت ایڈیشن چھپ چکے ہیں (اختر راہی۔ مقالہ، مطبوعہ المعارف لاہور ستمبر ۱۹۸۰ء، ص ۳۱، ۳۲)۔

ڈاکٹر غلام محمد مرحوم نے لکھا ہے:

النبی الخاتم اور الدین القیم کو مولانا کے شاگرد رشید ڈاکٹر غلام دستگیر رشید... نے مرتب فرمایا ہے۔ (مقالات احسانی، ص ۱۲)

حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

میں نے اپنی ساری عمر میں سیرت نبوی میں رحمۃ للعالمین (قاضی محمد سلیمان منصورپوری) اور النبی الخاتم سے زیادہ موثر کتاب نہیں پڑھی۔ کتاب پڑھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ صرف علم وانشاپردازی کی خوبی نہیں ہے، اس کے اندر اُن کا سوز دروں اور خونِ جگر بھی شامل ہے اور واقعہ بھی یہی ہے:

رنگ ہو یا خشت وسنگ چنگ ہو یا حرف وصوت
معجزہ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود

(پرانے چراغ، حصہ اول، کراچی ۱۹۸۴ء ص ۶۷)

مولانا خود بھی اپنی اس تصنیف کو اپنی مصنفات میں احسن قرار دیتے تھے۔ مولانا سید صلاح الدین عبدالرحمن نے ان کی ایک تحریر نقل کی ہے جس میں وہ فرماتے ہیں:

"فمن مصنفاۃ 'النبی الخاتم' وھی احسن کتب عندہ واعلاھا"

(۲) ظہور نور: یہ باون صفحہ کا ایک مختصر رسالہ ہے جو اولاً ماہنامہ الہند (دکن) میں شائع ہوا تھا۔ بعدہ "سچ" لکھنؤ میں بھی نقل ہوا تھا اور الہدیٰ بک ایجنسی، حیدرآباد دکن سے کتابچے کی صورت میں چھپا تھا۔ زبان اور اسلوب کے لحاظ سے بقول مولانا عبدالماجد دریابادی:

"ان خصوصیات کا حامل ہے جو مولانا کے قلم سے وابستہ ہو چکے ہیں۔" اس کے مضمون اور اسلوب کے بارے میں مولانا دریابادی لکھتے ہیں:

"چلی ہوئی میلادی روایات عموماً میلادی مکاشفے ہیں اور مولانا نے ان کی اس حیثیت کو اپنے مخصوص رنگ میں نمایاں کر دیا ہے۔ ساری کتاب اول سے آخر تک علمی بصیرتوں کے ساتھ ساتھ والہانہ انداز بیان کی دلچسپیوں کا ایک رنگین گل دستہ ہے۔"

(۳) دربار نبوت کی حاضری: ایک مختصر کتابچہ۔ کراچی سے شائع ہوا ہے۔ اولاً یہ

مقالہ الفرقان کے حج نمبر ۱۳۷۰ھ میں شائع ہوا تھا۔

(۳) خیر الامم کے طغرائے امتیاز: یہ سیرت نبوی کا خاص اور اہم مضمون ہے۔ مولانا گیلانی کا یہ پہلا مضمون ہے۔ جو ذی قعدہ ۱۳۳۱ سے ذی قعدہ ۱۳۳۲ھ تک القاسم کی پانچ قسطوں میں چھپا تھا اس مضمون کی قابل ذکر بات یہ بھی ہے کہ یہ زمانہ طالب علمی کی یادگار ہے۔ اور حضرت شیخ الہند کے اس فرمانے پر لکھا گیا تھا کہ القاسم میں مضمون لکھا کرو۔

دو مضامین اور بھی نظر سے گذرے ہیں جن کا شمار سیرت کے اطراف سے ہے ان کا حوالہ بھی اس مقام پر دے دینا چاہیے کہ یہی مناسب ہے۔

(۱) اسوۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم: القاسم، دیوبند

(۲) عالم غیب کا طویل سفر نامہ یا واقعہ اسراء و معراج: الفرقان، لکھنؤ ذیقعدہ و ذی الحجہ ۱۳۶۱ھ

سوانح

(۱) ابوذر غفاری: رسالہ القاسم دیوبند میں حضرت ابوذر غفاری کی شخصیت و سیرت میں ایک مقالہ متعدد اقساط میں لکھا تھا۔ یہی مقالہ بعد میں کتاب بنادیا گیا۔ ہندوستان اور پاکستان سے اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

(۲) بابا رتن ہندی: ایک ہندوستانی صحابی کا تذکرہ بھی مولانا کے قلم سے یادگار ہے۔ یہ مقالہ بھی ۱۹۷۸ء میں دیوبند سے کتابی شکل میں شائع ہو چکا ہے۔

(۳) امام ابو حنیفہ کی سیاسی زندگی: امام اعظم پر اُردو زبان میں بے شمار مواد موجود ہے۔ لیکن یہ کتاب اپنے موضوع پر سب سے مختلف اور نادر ہے۔ تاریخی، سیاسی، سوانحی معلومات اور علمی نکات سے بھری ہوئی ہے۔ سب سے پہلے نفیس اکیڈمی نے ۱۹۴۹ء میں کراچی سے ڈاکٹر حمید اللہ کے تعارف کے ساتھ شائع کی تھی۔

(۴) الف ثانی (یا ہزارۂ دوم) کا تجدیدی کارنامہ: مولانا کا یہ مقالہ الفرقان کے حضرت مجدد الف ثانی نمبر (۱۳۵۷ھ) میں شائع ہوا تھا۔ مذکورہ نمبر کے علاوہ اس کی تلخیص "افادات گیلانی نمبر" میں شامل ہے۔ اب مکمل مجدد الف ثانی نمبر دار الاشاعت کراچی نے کتابی صورت میں چھاپ دیا ہے۔ مولانا گیلانی کا مقالہ اس کے ایک سو دس صفحوں میں آیا ہے۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ (ف ۳۱ر دسمبر ۱۹۹۹ء) نے اس مقالے کے بارے میں تحریر فرمایا ہے: "ان کا مضمون 'الف ثانی کا تجدیدی کارنامہ'... ان کی بہترین و موثر ترین تحریروں میں ہے... اس مضمون سے بڑھ کر ان کی تجدیدی عظمت کو آشکار کرنے والا کوئی مقالہ نہیں۔

(۵) تذکرہ شاہ ولی اللہ: یہ ایک مقالہ ہے جو مولانا نے رمضان ۱۳۵۹ھ (اکتوبر ۱۹۴۰ء) میں لکھا تھا اور پہلی بار محرم ۱۳۶۰ھ / فروری ۱۹۴۱ء میں الفرقان بریلی کے شاہ ولی اللہ نمبر میں بعنوان "آغوش موج کا ایک ذرِ تابندہ یا اسلامی ہند کے طوفانی عہد میں خدا کا ایک وفادار بندہ" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ یہ مقالہ الفرقان کے ۱۳۳ صفحوں میں پھیلا ہوا ہے۔

الفرقان کا نمبر شائع ہوتے ہی ختم ہو گیا تھا۔ اس کے فوراً بعد دوسرے ایڈیشن کا انتظام کرنا پڑا۔ جو ایک ماہ کے وقفے سے ربیع الاول ۱۳۶۰ھ / اپریل ۱۹۴۱ء میں شائع ہوا۔ اس اشاعت میں اغلاط کی تصحیح و ترمیمات کے علاوہ نظم و نثر میں کئی مفید اور اہم اضافے بھی ہیں۔ یہ نمبر چونکہ بہت مقبول ہوا تھا۔ اس لیے اس کے بعض مقالے بہت جلد کتابی صورت میں شائع ہوئے۔ ان میں مولانا عبید اللہ سندھی اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے مقالات کے علاوہ مولانا سید مناظر احسن گیلانی کا یہ مقالہ بھی تھا۔ جو سب سے پہلے کتب خانہ الفرقان نے شائع کیا تھا۔ پھر حیدر آباد سے اور ۱۹۴۷ء کے بعد نفیس اکیڈمی کراچی سے کئی بار شائع ہوا۔ میرے سامنے اس کی ۱۹۶۵ء کی چوتھی اشاعت اور الفرقان کے خصوصی نمبر کی دوسری اشاعت ہے۔

اس مقالے (تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہ) کے بارے میں مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی نے لکھا ہے:

> "یہ بھی مولانا کی وسعتِ نظر اور دقتِ فکر کا شاہ کار ہے اور جیسا کہ ان کے مقالات کا عموماً اندازہ ہوتا ہے، معلومات کا ایک بحر مواج ہے... اس میں بھی مولانا نے... بڑی تفصیل کے ساتھ اس تاریک ماحول اور طوفانی عہد کا نقشہ کھینچا ہے، جس میں حضرت شاہ ولی اللہ کی ولادت ہوئی اور جس میں آپ کی ابتدائی زندگی گزری... مولانا کی باریک بینی اور دقیقہ رسی کا بصیرت افروز منظر دیکھ کر اسلامی ہند کی تاریخ کا طالب علم حیران رہ جاتا ہے"۔

(الفرقان۔ افادات گیلانی نمبر ص ۶، ۷)

(۶) سیرت بانی دارالعلوم: "مولانا محمد قاسم نانوتوی کی حیات و خدمات پر ایک سرسری نظر": مولانا گیلانی کا ایک مضمون "دارالعلوم" دیوبند کے ابتدائی شماروں (۴۲۔۱۹۴۱ء) میں شائع ہوا تھا۔ محمد عامر قمر نے مجلس یادگار گیلانی کراچی سے شائع کیا۔ بطور "تقدیم" قاری محمد طیب رحمہ اللہ کا حضرت نانوتوی پر ایک مضمون شامل ہے۔ اس کا پیش لفظ خاکسار (ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہاں پوری) کے قلم سے ہے۔ صفحات ۱۳۳، اشاعت ۱۹۹۹ء

(۷) سوانح قاسمی: تین حصوں میں مولانا محمد قاسم نانوتوی کے سوانح، سیرت اور خدمات، جلد اول صفحات ۶۱۲، تاریخ تصنیف: رجب ۱۳۵۴ھ، جلد دوم، صفحات ۵۱۲، تاریخ تصنیف ربیع الاول ۱۳۷۵ھ، جلد سوم: صفحات ۱۵۱+ ۲۴ = ۱۷۵، تاریخ تصنیف: رجب ۱۳۷۲ھ (۱)

جلد چہارم آغاز سے آگے نہ بڑھ سکی۔ اسکے صرف ۱۷ صفحے داغ حسرت وناکامی کی یادگار ہیں اور حقیقت تو یہ ہے کہ تیسری جلد بھی حضرت گیلانی کے ذوق بادہ پیمائی وصحرا نوردی کے شایان شان نہیں۔ یوم الاثنین رجب ۱۳۷۲ھ / ۱۶؍اپریل ۱۹۵۳ء تک جو تیسری جلد کے اختتام کی تاریخ درج ہے۔ اس کے تقریباً دوسال بعد مولانا سعید احمد اکبر آبادی کے نام ایک خط مورخہ ۷؍فروری ۱۹۵۵ء میں مولانا گیلانی علیہ الرحمہ لکھتے ہیں:

"تیسری دیکھیے لکھی بھی جاتی ہے یا نہیں؟ مگر زیادہ دھیمی رفتار سے کام ہو رہا ہے"۔

سوانح قاسمی حضرت گیلانی کے ذوق وخصائص تصنیف کے مطابق معلومات کا گنجینہ، افکار کا حسین گلدستہ، جامعیت کا نادر مرقع ہے۔ اگر تالیف و تدوین کے اُصول، مسائل کی ترتیب اور مباحث کی شیرازہ بندی جو حیات جاوید (حالی) اور حیات شبلی (سلیمان) میں نظر آتی ہے۔ اگر ان کی پابندی اس میں کی جاتی تو سوانح نگاری کے اُصول اور فن کے لحاظ سے بھی سوانح قاسمی ایک شاہ کار تسلیم کی جاتی۔ اس لیے کہ بعض فنی کمالات کے سوا حضرت مولانا

(۱) جلد دوم کی تاریخ اختتام تصنیف ربیع الاول ۱۳۷۵ھ اور جلد سوم کے اختتام تصنیف کی تاریخ رجب ۱۳۷۲ھ ہے۔ جلد سوم کا مقدمہ اور جلد دوم کا تاخر بظاہر خلاف قاعدہ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ واقعہ یہ پیش آیا ہوگا کہ جلد سوم کے مباحث پہلے زیر قلم آگئے ہوں گے۔ لیکن ترتیب مضامین میں انھوں نے آخر میں جگہ پائی۔

قاسم کا علمی مقام سرسید اور شبلی وغیرہ سے بہت بلند تھا، اور ذہن وفکر کے محاسن میں وہ ایک نادر روزگار شخصیت تھے۔

مولانا عبدالماجد دریا آبادی مرحوم نے سوانح قاسمی کی پہلی اور دوسری جلد پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا:

"(سوانح قاسمی جلد اول): مولانا گیلانی کے قلم کی بے تماشہ روانی اس قید وبند کی کب روادار ہے کہ فن یا حاشیے میں جو کچھ درج ہوا، سب حدود موضوع کے اندر ہی ہوا۔ فقہ، کلام، ادب، سیاست، تاریخ، تصوف خدا معلوم کہاں کہاں کے مسائل جیسے خود بخود چھڑتے چلے گئے ہیں اور یہ کتاب بھی مولانا کی دوسری کتابوں کی طرح ایک اچھی خاصی کشکول بن گئی ہے"۔

(صدق جدید، ۱۴؍مارچ ۱۹۵۵ء)

(سوانح قاسمی جلد دوم): کتاب محض ایک بزرگ وفاضل کی ذاتی سوانح عمری نہیں، بلکہ تاریخ، تصوف، کلام وغیرہ کے بیسوں مسائل کا ایک دلچسپ وبصیرت افروز مجموعہ ہے۔ حضرت قاسم کا بیان اور پھر مولانا گیلانی کی زبان، دلآویزی کو کیا کہیں سنتے جاتا ہے۔" (صدق جدید ۲۴؍فروری ۱۹۵۶ء، ص ۴)

حدیث وفقہ

(۱) تدوین حدیث: مولانا گیلانی کے یہ چار توسیعی لیکچر ہیں جو جامعہ عثمانیہ میں پڑھے گئے تھے۔ اولاً یہ جامعہ عثمانیہ کے ریسرچ جرنل میں چھپے تھے۔ پھر یہ اپریل تا جون ۱۹۴۱ء میں معارف، اعظم گڑھ، کے تین نمبروں میں چھپے۔ پھر جنوری ۱۹۴۸ء تا اکتوبر ۱۹۵۱ء کے برہان، دہلی، میں اکتیس قسطوں میں بہت ترمیم واضافہ کے ساتھ شائع ہوئے تھے۔ ۱۹۵۶ء میں مجلس علمی کراچی نے اسے کتابی شکل میں شائع کیا۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا تھا:

"مولانا گیلانی کا قلم جب چل پڑتا ہے تو پھر سرگشتۂ خمار رسوم وقیود رہنا نہیں جانتا۔ چنانچہ اس کتاب میں بھی خاص موضوع بحث کے علاوہ فن حدیث وفقہ، تاریخ وسیرت سے متعلق سینکڑوں وثائق ولطائف ہیں جو علماء اور طلباء

کے لیے بڑے کام کی چیز ہیں۔" (برہان۔ دہلی)

مولانا گیلانی کی اس کتاب کی واقعی اہمیت مولانا عبدالماجد دریابادی کے تبصرے کے مطالعے کے بغیر واضح نہیں ہو سکتی۔ مولانا دریابادی نے اس پر مفصل اور جامع تبصرہ کیا ہے۔ یہ تبصرہ بحیثیت تبصرہ بھی مولانا کے بہترین تبصروں میں شمار ہونے کے لائق ہے۔ قارئین محترم کی ضیافت طبع کے لیے یہاں نقل کیا جاتا ہے۔ مولانا لکھتے ہیں:

"تدوین حدیث کی مفصل تاریخ یوں بھی اہم علمی ضروریات میں سے تھی۔ اور امت کے اوپر یہ قرض مدت سے چلا آرہا تھا کہ حال میں جو تحریک انکار حجیت حدیث زور پکڑ گئی ہے۔ اس نے اس علمی ضرورت کو ایک اہم دینی ضرورت بھی بنا دیا ہے ـــ الحمد للہ کہ اس موضوع پر قلم فاضل گیلانی نے اٹھایا۔ جن سے زیادہ اہل اور موزوں اس خدمت کے لیے کوئی دوسرا اتھا بھی نہیں۔ موضوع ایسا کہ قدیم رنگ کے کوئی مولوی صاحب اس کا حق ادا ہی نہیں کر سکتے تھے۔ کارخانۂ غیب سے اس کے لیے قرعۂ انتخاب ایسے شخص کے نام پر پڑا جس کا دل و دماغ قدیم کے ساتھ ساتھ جدید بھی تھا اور جس کا قلم دیوبندی ہونے کے باوجود ندوی تھا۔

فاضل گرامی نے اس عنوان پر چار مفصل محاضرہ یا مقالے عرصہ ہوا تحریر فرمائے تھے۔ اور وہ کچھ تھوڑے بہت بعض رسالوں میں چھپ بھی گئے تھے۔ ادارہ مجلس علمی قابل صد تبریک و تہنیت ہے کہ اس نے اس علمی خزانہ کو برآمد کر کے۔ اور اس کو مکمل صورت میں شائع کر دیا۔ اور بہترین خیر اور داد کے مستحق مولوی شاہ غلام محمد بی اے حیدرآبادی ثم کراچوی ہیں جنھوں نے کتاب کی ترتیب و تہذیب کے جملہ فرائض انجام دئے اور شروع میں ایک خوب مفصل جامع اور بصیرت افروز فہرست مضامین کا اضافہ کر دیا۔

مباحث و مضامین کے لحاظ سے کتاب کا تعارف سرورق پر کر دیا گیا ہے کہ اس میں حدیث کی شرعی حقیقت حدیث کی دینی اہمیت و ضرورت، اس کی تدوین و حفاظت اور اس کے معیار رد و قبول کے متعلق جملہ مباحث پر

نہایت تحقیقی و تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔ نیز ان شکوک و شبہات کا نہایت اطمینان بخش جواب دیا گیا ہے جن کی وجہ سے بعض لوگ حجیت حدیث کا انکار کرنے لگتے ہیں۔

اور یہ تعارف اشتہاری قسم کا نہیں۔ شائبہ مبالغہ سے پاک اور تبصرہ کے نقطۂ نظر سے بھی صحیح و جامع اور کافی ہے۔

بیسیوں عنوانات کتاب میں سے صرف چند بہ طور نمونہ ملاحظہ ہوں (۱) حدیث کی حقیقت (۲) عام تاریخ اور فن حدیث، (۳) تدوین حدیث کے قدرتی عوامل۔ (۴) حدیث کا بڑا حصہ متواتر ہے۔ (۵) قرآن کی طرح حدیث کے بھی حفظ کا اہتمام تھا۔ (۶) قرون اول میں 'علم' کے معنی ہی حدیث کے تھے۔ (۷) تدوین حدیث کا ماحول (۸) اجتہاد کا حال (۹) حفاظت اور کتابت۔ (۱۰) خبر احاد کا درجہ، (۱۱) حجیت حدیث کے متعلق چند قرآنی دلائل۔ (۱۲) صحابیت اور حدیث رسول کے خلاف پہلا ناپاک اقدام۔

شروع میں تعارف کے عنوان سے ۴ صفحہ سید الملت مولانا سید سلیمان ندوی کے قلم سے ہیں۔ اس کا پہلا پیرگراف بھی اپنی معنویت کے لحاظ سے قابل اخذ و نقل ہے۔:

"علم القرآن اگر اسلامی علوم میں دل کی حیثیت رکھتا ہے تو علم حدیث شہ رگ کی۔ یہ شہ رگ اسلامی علوم کے تمام اعضاء و جوارح تک خون پہنچا کر ہر آن ان کے لیے تازہ زندگی کا سامان پہنچاتا رہتا ہے۔ آیات کا شان نزول اور ان کی تفسیر، احکام القرآن کی تشریح و تعیین، اجمال کی تفصیل، عموم کی تخصیص، مبہم کی تعیین سب علم حدیث کے ذریعہ معلوم ہوتی ہے۔ اسی طرح حامل قرآن محمد رسول اللہ صلعم کی سیرت اور حیات طیبہ اور اخلاق و عادات مبارک اور آپ کے اقوال و اعمال اور آپ کے سنن و مستحبات، اور احکام و ارشادات اسی علم حدیث کے ذریعہ ہم تک پہنچے ہیں"

حسن استنباط، نکتہ آفرینی، دقت نظر مولانا کی تحریروں کے خاص جوہر ہیں اور وہ اس کتاب میں بھی اول سے آخر تک نمایاں ہیں اور بعض جگہ تو ضمناً اور

سلسلۂ بیان میں ایسی حقیقتیں کہہ گزرتے ہیں جن کی طرف عوام کیا معنی، خواص کا ذہن بھی مشکل ہی سے منتقل ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ص ۱۱۳ پر لکھتے ہیں:

"جہاں تک لوگوں کے بیان سے معلوم ہوتا ہے اس زمانہ میں مطلق "علم" کا لفظ جب بولا جاتا تو اس سے مقصود وہی علم جدید ہوتا تھا جو محمد رسول اللہ صلعم کے ذریعہ سے مسلمانوں میں پہنچا تھا۔ ابن سعد نے عطاء بن ابی رباح کے حال میں لکھا ہے کہ ابن جریج کہتے تھے کہ عطاء جب کوئی روایت بیان کرتے تو میں پوچھتا کہ علم ہے یا رائے (ہے) اگر حدیث ہوتی تو کہتے کہ علم ہے اور رائے ہوتی (یعنی علماء کے پیدا کیے ہوئے استنباطی نتائج سے اس کا تعلق ہوتا) تو کہتے کہ رائے ہے۔ (ابن سعد جلد ص ۵، ص ۳۴۵)۔

اور اس حقیقت کو کتاب کے آخری حصوں میں بھی بار بار بیان کیا گیا ہے۔

کتاب تاریخ حدیث پر تو ہے ہی۔ اس کے علاوہ عقائد و کلام پر بھی ایک اعلا کتاب کا کام دے سکتی ہے۔ کتاب جہاں منکرین حدیث کے پیدا کیے ہوئے شبہات کے تسکین بخش جواب دیتی ہے اور دلوں میں تسلی پیدا کرتی ہیں۔ وہیں دوسری طرف حدیث کے ماننے والوں کے غلو اور خبر احاد کو اس کے مرتبہ سے بڑھ کر رکھنے والوں کی مبالغہ پسندی کی بھی اصلاح کرتی جاتی ہے۔ اپنے مختصر سے دیباچہ میں کتنی جچی تلی بات مولانا فرما گئے ہیں:

میرا تو خیال ہے کہ اس کتاب کے پڑھ لینے کے بعد شاید لوگ اسی نتیجہ تک پہنچیں گے کہ انکار و اقرار دونوں کے صحیح حدود سے باہر نکل کر لوگ باتیں کر رہے ہیں۔ ابتدا اسلام سے اسوقت تک حدیث کا ایک خاص مقام مسلمانوں کی دینی زندگی میں رہا ہے۔ یہی اس کا طبعی مقام ہے۔ خصوصاً حدیثوں کا وہ ذخیرہ جس کی اصطلاحی تعبیر خبر احاد سے محدثین کرام فرماتے ہیں۔ بہرحال قرآن اور قرآنی مطالبات کے عملی قوالب تشکیلات کے سوا مسلمانوں کی دینی زندگی کی تعبیر میں اول سے آخر تک حدیث بھی شریک ہے۔ یہ ایک ایسی ناقابل انکار حقیقت ہے۔ جس کا انکار وہ بھی نہیں کر سکے جو

مسلمان نہیں ہیں... منکرین حدیث اگر اس واقعہ کے منکر ہیں تو وہ خود بھی جانتے ہیں کہ جھوٹ بول رہے ہیں... لیکن انکار سے انکا مطلب اگر یہ ہے کہ قرآن اور قرآنی مطالبات کو مسلمانوں کی دینی زندگی میں جو اہمیت حاصل ہے وہ اہمیت کسی زمانہ میں خبر احاد کو نہیں دی گئی جن پر حدیثوں کا عام ذخیرہ مشتمل ہے۔ اگر ان کے انکار کا حاصل یہی ہے تو پھر ان کا یہ انکار ایک ایسا انکار ہے جس کا اقرار ہر زمانہ میں مسلمان کرتے آئے ہیں اور آج بھی وہ اسی کے قائل ہیں"۔ (ص ۱۰۰۹)

خبر احاد (ص ۲۰۸۔۲۱۰) کے درجہ پر اور البینات ص ۳۷۸) کے مرتبہ ومقام پر نیز اس حقیقت پر کہ قرون اولیٰ میں حدیث کی کتابت واشاعت کا اہتمام خصوصی نہ ہونا ارادۃً اور اس مصلحت پر مبنی تھا کہ امت کے لیے وسعت اور آسانی زیادہ سے زیادہ رہے۔ (ص ۲۱۷ تا ۲۲۸) ان کے قلم نے جو داد تحقیق دی ہے، یہ صرف وہی کر سکتے تھے۔ یہ انھیں کا حصہ تھا۔ اچھے اچھے علماء وفضلا بھی باوجود علامہ انور شاہ کاشمیری کی سند و توثیق موجود ہونے کے عجب نہیں جو اتنی جراءت نہ دکھا سکیں۔ اور ان منزلوں پر پہنچ کر ان دونوں بزرگوں کا ساتھ چھوڑ دیں۔

بہرحال امت کے سامنے کم سے کم ایک مستند قلم سے ان حقائق کا انکشاف بھی ہو گیا۔

یہ حقیقت بھی کس درجہ دردناک ہے کہ علامہ اپنے اس شاہکار کو مکمل مطبوعہ صورت میں اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ سکے اور اس کے شائع ہونے سے قبل ہی سفر جنت پر روانہ ہو گئے۔ اللہ کی بیشمار رحمتیں ہوں۔ ایسی فاضلانہ اور گراں مایہ کتاب کے مصنف پر! (صدق جدید لکھنؤ، ۱۹ اپریل ۱۹۵۷ء ص ۴-۵)

انسان کی کوئی کوشش غلطیوں سے پاک نہیں ہو سکتی۔ "تدوین حدیث" میں مولانا گیلانیؒ کے قلم کے بعض تسامحات بھی در آئے تھے۔ ڈاکٹر حمید اللہ کی نظر سے کتاب گذری تو انھوں نے بعض تسامحات کو نوٹ کر لیا تھا اور ڈاکٹر غلام محمد صاحب (مرحوم) کو ایک خط میں لکھ دیے تھے۔ ان کی نظر سے مولانا دریابادی کا تبصرہ گزرا تو انھوں نے مولانا کو مطلع کیا اور

انھوں نے صدق جدید میں ان کی اشاعت ضروری سمجھی۔ مولانا نے یہ تفصیل صدق جدید میں چھاپ دی تھی۔ آج اس تصحیح کا شائع کرنا اس لیے نہایت ضروری ہے کہ اگر کسی صاحب کے پاس ''تدوین حدیث'' کا ایسا نسخہ ہو جس میں تصحیح نہ کی جا سکی ہو تو وہ تصحیح فرمالیں۔ مولانا کا نوٹ یہ ہے:

تدوین حدیث

(از عبدالماجد)

فاضل گیلانی کی محققانہ تصنیف ''تدوین حدیث'' کا تعارف (صدق۔ ۲۰ مورخہ ۱۹/ اپریل ۵۷ء میں کیا جاچکا ہے۔ بھول چوک سہو نسیان لازمۂ بشریت ہے جس سے کوئی بڑا سا بڑا فاضل و محقق بھی محفوظ نہیں، کتاب مذکور کے صفحہ ۴۷ سے ۷۷ تک جہاں طویل العمر صحابیوں کی عمریں درج ہیں خدا معلوم کس طرح خانۂ عمر میں ۲۰۔۲۰ سال کا اضافہ ہو گیا ہے۔ اس پر نظر بھی مولانا ہی کے ایک محقق شاگرد ڈاکٹر حمید اللہ حیدر آبادی ثم فرنسی کی پڑی اور ان کی توجہ دہانی پر ایک دوسرے شاگرد غلام محمد صاحب عثمانیہ نے جو مکتوب صدق کو ارسال فرمایا ہے وہ درج ذیل ہے:

''تدوین حدیث میں عہد صحابہ کی مدت عمر سے متعلق ایک فاش غلطی رہ گئی ہے صفحہ ۴۷ کے آغاز سے صفحہ ۷۷ تک جو اعداد و شمار دیے گئے ہیں ان میں تقریباً ۲۰۔۲۰ برس کا اضافہ ہوا ہے۔ اس غلطی پر ترکی سے محترم ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے متنبہ فرمایا ہے۔

اب اصل کتابوں سے مراجعت کے بعد اعداد و شمار کی تصحیح کر دی گئی ہے اور سہولت کی خاطر پورا ایک جزو دوبارہ لکھوا کر ان تمام حضرات کی خدمت میں بھیجا جا رہا ہے جن تک کتاب پہنچ چکی ہے اور جو نسخے موجود ہیں ان میں یہ مصحح جزو لگا دیا گیا ہے۔ چونکہ ہر خریدار تک مصحح جزو کا پہنچنا شاید ناممکن ہو اس لیے اگر صرف مصحح عبارت صدق میں شائع فرما دیں تو اطلاع عام کا فائدہ حاصل ہو جائے گا۔ مصحح عبارت نشان زد کر دیا گیا ہے۔ امید ہے

کہ گنجائش نکلنے پر صدق میں شائع فرمادیا جائے گا۔

لیکن اگر اتنا ہی چھاپا جائے تو کتاب کے پورے تین صفحے نقل کرنے ہوں گے اور اتنی گنجائش نکالنا صدق کے لیے ایک بڑا بار ثابت ہوگی۔ امید ہے کہ محض اتنی اطلاع کافی ہو جائے گی۔ اور جو خریدار صاحب چاہیں گے یہ اوراق ناشر کے یہاں سے منگالیں گے۔ پتا: ادارہ مجلس علمی میری ویدر نادر کراچی (پاکستان)۔ (صدق جدید، لکھنؤ، ۱۲/ جولائی ۱۹۵۷ء، ص ٦)

منکرین حدیث کے رد اور ان کے اعتراضات کے دفاع میں یہ نہایت مفید کتاب ہے کتابی صورت میں اسے ڈاکٹر غلام محمد مرحوم نے مرتب کیا تھا۔

(۲) مقدمہ تدوین فقہ: ''تدوین فقہ'' کے عنوان سے مولانا کا ایک سلسلہ مضامین برہان بابت جنوری تا ستمبر ۱۹۴۵ء میں چھپنا شروع ہوا تھا۔ لیکن یہ سلسلہ نو قسطوں تک پہنچا تھا۔ اور بحث فقہ کے اصول و مبادی سے آگے نہ بڑھی تھی کہ سلسلہ رک گیا اور تدوین فقہ کی تاریخ مکمل نہ ہو سکی۔ تدوین فقہ کے مقدمہ کے طور پر قیام پاکستان کے بعد ڈاکٹر رشید احمد جالندھری نے مدون کیا۔ مکتبۂ رشیدیہ لاہور سے ۱۹۷٦ء میں شائع ہوا۔

(۳) ایک فتوی: مسئلہ رویت ہلال (ایک استفتاء کے جواب میں) صدق جدید لکھنؤ۔ ۲۳ نومبر ۱۹۵۱ء،

(۴) چاند کے بارے میں ریڈیو کی خبر: الفرقان، رمضان، شوال ۱۳۸۳ھ

تعلیم و تربیت

(۱) ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت: بڑے سائز پر مولانا کی یہ تصنیف دو حصوں پر مشتمل ہے: حصہ اول صفحات ۳۹۰، حصہ دوم صفحات ۳٦۰۔ یہ کتاب ندوۃ المصنفین دہلی نے شائع کی تھی اب پاکستان میں مکتبہ رحمانیہ لاہور نے چھاپ دیا ہے۔

ہندوستان کو وطن بنانے کے بعد مسلمانوں نے اس ملک میں تعلیم و تربیت کا جو نظام قائم کیا تھا اس کتاب میں اس کی عجیب و غریب خصوصیات کو صحیح اور معتبر تاریخی شہادتوں کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے۔ اساتذہ، طلبہ، طریقہ تعلیم، نصابی تغیرات، طلبہ کے قیام و طعام، کتابوں کی فراہمی کے انتظامات، ان کلی مباحث کے ساتھ کتابت میں مسلمانوں کی حیرت انگیز

چابک دستیاں، اشاعت کتب کے طریقے، مسلمانوں سے پہلے اس ملک میں کاغذ کا فقدان، کاغذ سازی کے کارخانے، کاغذ کے اقسام، سلاطین اور علماء کا تعلیم سے تعلق، ہندوستان میں تعلیمی نصاب کی ہر زمانے میں افادے کے لحاظ سے برتری، بیرونِ ہند کے اسلامی ممالک میں ہندوستانی علماء کا امتیاز و تفوق، ان کے سوا بلا مبالغہ بیسیوں نکات و حقائق جن کا مختلف اہم مسائل سے تعلق ہے، اس کتاب میں پہلی دفعہ پیش کیے گئے ہیں۔ سید محبوب رضوی لکھتے ہیں:

"ان کی کتاب 'ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت' اپنے موضوع پر معلومات کا بیش بہا خزانہ ہے، ہندوستان میں قطب الدین ایبک کے عہد سے موجودہ عہد تک... اس موضوع کا کوئی گوشہ نہیں جس پر سیر حاصل بحث نہ ہو۔ کتاب موثر اور دل چسپ ہے"۔ (تاریخ دار العلوم دیو بند، سید محبوب رضوی)

اس کتاب کے کم از کم تین ایڈیشن ضرور شائع ہوئے ہیں۔ دوسرا نظر ثانی شدہ ایڈیشن ۱۹۶۵ء یا ۱۹۶۶ء میں شائع ہوا تھا۔ مولانا دریابادی نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا:

"یہ ان کی دل چسپ کتاب کا تازہ ایڈیشن ہے جس کے مسودے کی نظر ثانی اضافہ و تصحیح چند مصنف کر چکے ہیں اور اب یہ ناپید ایڈیشن پہلے سے زیادہ مرتب ہو کر نہ صرف مفصل فہرست مضامین بلکہ بعض عنوانوں کے اضافے کے ساتھ آب و تاب سے نکلا ہے۔

کتاب بہ ظاہر ایک محدود موضوع پر ہے اور صرف اہل علم کے ایک مختصر سے گروہ کے پڑھنے کے قابل۔ لیکن فی الحقیقت ایسا نہیں ہے۔ کتاب بڑی ہی شگفتہ انداز میں لکھی گئی ہے۔ عالم عامی سب کے لیے دل چسپ اور کسی ایک محدود موضوع پر نہیں۔ مضامین کا ایک ابلتا ہوا سمندر ہے۔ تاریخ کے خدا معلوم کتنے نادر واقعات اور نکتے بے ساختہ اور بے تکلف آتے چلے گئے ہیں۔ کتاب کہنا چاہیے کہ بیش بہا معلومات کا ایک گنجینہ اور علمی نکتہ سنجیوں کا خزانہ ہے۔ افسوس ہے کہ بیان کے زور روانی میں کہیں کہیں ایسے فقرے بھی نکل گئے ہیں، جو ایک خاص فرقے کے لیے کبیدگی کا باعث ہو سکتے ہیں، لیکن ایسے فقرے خال ہی خال ہیں اور انھیں آسانی سے بدلا

جا سکتا ہے۔"

مولانا دریابادی کا یہ تبصرہ صدق جدید، لکھنؤ۔ بابت کا شمارہ مورخہ ۶/ مئی ۱۹۶۶ء (صفحہ ۶) میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد دوسری اشاعت ۱۹۸۴ء میں اور تیسری اشاعت ۱۹۸۷ء میں منصۂ شہود پر آئی تھی۔ اس کی ایک نقل پاکستان میں بھی چھاپی گئی ہے۔

مسلمانوں کے نظام تعلیم وتربیت ہی کے سلسلے میں مرحوم کے چند مضامین اور قابل ذکر ہیں یہ مضامین اگرچہ ابھی کتابی صورت میں شائع نہیں ہوئے ہیں لیکن ان کی اہمیت کا تقاضا ہے کہ ان کا ذکر اسی مقام پر کر دیا جائے:

(۲) دار العلوم دیو بند (تین قسطیں): الفرقان، لکھنؤ ذیقعدہ و ذی الحجہ ۱۳۵۷ھ محرم و صفر ۱۳۵۸ھ (جنوری تا اپریل ۱۹۳۹ء)

(۳) میرا مجوزہ تعلیمی خاکہ: المعارف اعظم گڑھ جولائی ۱۹۴۵ء (یہ مضمون "مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت" کی دوسری اشاعت کے آخر میں شامل کر لیا گیا ہے)

(۴) دار العلوم کی بنیاد کے چند (غیر معروف گوشے): دار العلوم دیو بند رمضان ۱۳۷۲ھ (جون ۱۹۵۳ء)

(یہ مضمون ایک خط کی صورت میں ہے جو مولانا قاری محمد طیب مرحوم کے نام لکھا گیا تھا۔)

معاشیات

(۱) اسلام اور نظام جاگیرداری و زمینداری: مولانا گیلانی مرحوم کا یہ مقالہ اولاً رسالہ معارف اعظم گڑھ میں دسمبر ۱۹۵۲ء اور جنوری ۱۹۵۳ء کے دو شماروں میں چھپا تھا۔ مولانا نے اسے ترمیم اور اضافوں کے بعد اشاعت کے انتظام کے لیے مولانا سید ابوالخیر مودودی کو دے دیا تھا۔ مدت کے بعد ۱۹۷۵ء میں یہ مقالہ ڈاکٹر محمد یوسف گورایہ کی تصحیح متن، تخریج حوالہ جات، صراحتِ مآخذ، تبویب مضامین اور ذیلی عنوانات کے اضافہ و تزئین کے بعد (محکمہ اوقاف پنجاب) لاہور سے شائع ہوا۔

(۲) اسلامی معاشیات: مولانا گیلانی مرحوم کی یہ کتاب پہلے معارف (اعظم گڑھ) میں اپریل تا اکتوبر ۱۹۴۳ء اور اپریل تا دسمبر ۱۹۴۴ء سولہ قسطوں میں شائع ہوئی تھی۔ صفر ۱۳۶۳ھ (۱۹۴۴ء) سے تقریباً ایک سال تک اس کے مختلف حصے الفرقان بریلی میں بھی شائع

ہوئے تھے۔ مئی ۱۹۴۷ء میں پہلی بار کتابی شکل میں حیدر آباد دکن سے اور اس کے بعد دارالاشاعت کراچی سے شائع ہوئی۔

تصوف

مقالات احسانی: اس مجموعے میں مولانا گیلانی کے مطبوعہ وغیر مطبوعہ چھ مقالے ہیں جنھیں ڈاکٹر غلام محمد مرحوم نے مرتب کیا ہے۔ اور ادارۂ مجلس علمی کراچی نے شائع کیا۔ مجموعے کے سرورق پر مشمولات کا تعارف ان الفاظ میں کرایا گیا ہے:

"تصوف واحسان کے موضوع پر چند ایمان افروز اور روح پرور مضامین کا نادر مجموعہ" اس مجموعے میں یہ مقالات شامل ہیں:

۱- تصوف کے دو طریقے
۲- طریقہ غزالیہ
۳- اختلافات سلاسل کی حیثیت
۴- طریقہ اشغال مطلقہ یا اطلاقی تصوف
۵- ابن تیمیہ کا نظریہ مخدومیت
۶- محاسن الجھن یا "دل کا چین"

مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے مقالات احسانی پر تبصرے میں لکھا تھا:

"مولانا گیلانی کا قلم کیا تھا، ایک ابر گہر بار تھا کہ جس موضوع کی طرف رخ کیا تحقیق واکتشافات، اسرار وحقائق اور علم وفکر کے چمن کھلاتا چلا گیا۔ ایک مرتبہ تصوف کی طرف متوجہ ہوئے تو "اطلاقی تصوف" کے نام سے ایک نہایت بیش قیمت اور بصیرت افروز مقالہ سپرد قلم کیا، جس میں سلوک وطریقت کے مختلف طریقوں، ان کی فنی اور شرعی حیثیت اور ان کے باہمی اختلافات کے وجوہ واسباب کے تجزیہ وتحلیل کے بعد یہ ثابت کیا کہ تصوف کی اصل غرض وغایت اس صفت احسان کا پیدا کرنا ہے جس کا ذکر قرآن میں ضمناً واشارۃً اور حدیث میں بلاواسطہ اور صراحۃً ہے۔ اور اس صفت کا حصول تصوف کے مروجہ طریقوں کے اوپر موقوف نہیں ہے... صفتِ احسان کے

حصول کا یہ طریقہ دل وجان سے احکام شریعت کی پابندی ہے۔ مولانا نے اس کا نام "اطلاقی تصوف" رکھا ہے۔ (برہان، دہلی، اپریل ۱۹۶۰ء، ص ۲۵۵-۵۶)

میرے پیش نظر اس کی اشاعت ثانی ۱۳۹۹ھ (۱۹۷۹ء) ہے۔

دیگر کتب اور مجموعۂ مضامین

(۱) افادات گیلانی: یہ الفرقان کا خصوصی شمارہ ہے جو ۱۹۵۷ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کے دو حصے ہیں۔ پہلا حصہ ۴۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں مولانا گیلانی مرحوم کی شخصیت وخدمات کے تعارف میں ذیل کے تین مضمون ہیں:

۱- نگاہ اولین — از مولانا عتیق الرحمن سنبھلی
۲- مولانا سید مناظر احسن گیلانی — از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی
۳- مولانا گیلانی اور الفرقان — از مولانا محمد منظور نعمانی

دوسرا "افادات مولانا سید مناظر احسن گیلانی" کے عنوان سے صفحہ ۴۷ سے صفحہ ۲۱۵ تک پھیلا ہوا ہے۔ اس حصے میں مولانا کے یہ چار مقالے ہیں:

۱- الف ثانی (یا ہزارۂ دوم) کا تجدیدی کارنامہ
۲- حج کیا ہے؟
۳- دجالی فتنہ اور سورۂ کہف
۴- وفا شعاری کے دو نادر نمونے

یہ چاروں مضمون الفرقان ہی میں چھپے تھے۔ اس نمبر میں ان کی اشاعت ثانی ہے۔ اور پہلے تین مضمون بہ حک وترمیم اور ملخص ہیں۔ آخری مضمون اشاعت اول کے مطابق ہی معلوم ہوتا ہے۔ پہلے مضمون میں تحذیف وترمیم کا عمل مولانا نسیم احمد فریدی امروہی نے انجام دیا اور دوسرے اور تیسرے مضمون کی تحذیف وتدوین مولانا عتیق الرحمن سنبھلی نے کی ہے۔

یہ نمبر ۲۱۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی نے اس نمبر پر تبصرے میں لکھا تھا:

"ان مضامین کی تعداد چار ہے... چاروں میں سے کوئی مضمون ایسا نہیں جو

سطحی یا کم رتبہ ہو۔ ہر مضمون تاریخ، ادب، علوم قرآنی، حکمت ایمانی کے مختلف پہلوؤں سے قابل داد ہے اور ایک خاص رنگ کی انشا تو مولانا کے قلم کا حصہ ہے۔ تصوف و معرفت کے نکتے کہنا چاہیے کہ ہر جگہ پھیلے ہوئے ملیں گے اور یہ دیکھ کر بس اللہ کی قدرت نظر آتی ہے کہ جو آیتیں اور حدیثیں ہر پڑھے لکھے کے علم میں ہیں، مولانا نے ان سے بھی کیسے کیسے لطیف و نادر نکتے پیدا کر دکھائے ہیں"۔ (صدق جدید، لکھنؤ، ۱۶/اگست ۱۹۵۷ء، ص ۶)

(۲) علمائے دیوبند کی یادگار تحریریں: اس کے عنوان سے دو جلدوں میں (۴۲+۳۲=۷۴) مضامین ملتان کے ایک ادارے نے شائع کیے ہیں۔ اس کی پہلی جلد کے اکثر مضامین القاسم والرشید (دیوبند) سے ماخوذ ہیں اور دوسری جلد کے بیشتر مضامین دارالعلوم (دیوبند) سے اخذ کیے گئے ہیں۔ اس سے زیادہ کسی مضمون کے بارے میں کوئی صراحت یا کوئی اشارہ موجود نہیں کہ کون سا مضمون کس رسالے سے اور اس کے کس شمارے سے لیا گیا ہے۔ ان دو جلدوں میں سب سے زیادہ مضمون (۲+۱۸=۲۰) حضرت مولانا گیلانیؒ کے قلم کے یادگار اور تحقیق کے شاہ کار ہیں۔

(۳) احاطہ دارالعلوم میں بیتے ہوئے دن: یہ سلسلہ مضمون مولانا گیلانی کی زندگی کے بارے میں ان کی اپنی یادداشتوں پر مشتمل ہے۔ دارالعلوم میں مولانا ۱۹۱۳ء کے آخر سے ۱۹۱۴ء کے آخر تک تقریباً ایک سال دورہ حدیث کے طالب علم کی حیثیت سے اور اس کے بعد کچھ عرصہ القاسم، الرشید کے مدیر اور دارالعلوم کے مدرس کی حیثیت سے رہے تھے۔ لیکن یہ یادداشتیں صرف اس زمانے کی نہیں بلکہ اس سے ۱۳۲۴ھ/۱۹۰۶ء (ٹونک کے زمانہ طالب علمی) سے ۱۹۱۷ء (حیدر آباد میں ملازمت) تک کے حالات قدرے مفصل اور ۱۹۱۷ء کے بعد سے ۱۹۴۹ء (ملازمت سے سبک دوش ہونے) تک کے مجمل حالات پر مشتمل ہیں۔

یہ سلسلہ مضمون ماہنامہ دارالعلوم دیوبند میں اکتوبر ۱۹۵۱ء سے اگست ۱۹۵۵ء تک تیس قسطوں میں چھپا تھا۔ یہ مولانا کی نہایت دل چسپ خود نوشت ہے اور ۱۹۹۸ء میں کراچی اور ملتان سے کتابی صورت میں شائع ہو گئی ہے۔

(۴) مجالس الشیخین: مولانا کا یہ سلسلہ مضمون دارالعلوم دیوبند (ماہنامہ) کی پہلی

جلد (مارچ تا ستمبر ۱۹۵۱ء) کے چھ شماروں میں اور پانچ سال کے وقفے کے بعد جلد ۱۲، ۱۳ (دسمبر ۱۹۵۱ء تا مئی ۱۹۵۷ء) کے چھ شماروں میں شائع ہوا تھا۔

تصوف و طریقت کے باب میں حضرت محی الدین ابن عربیؒ اور مولانا رومؒ کے افادات و ارشادات کا لاجواب مجموعہ ہے۔ مولانا نے اسے ڈائری کی شکل میں مرتب کیا ہے۔ نہایت سبق آموز، فکر انگیز، ایمان افروز اور روح پرور سلسلہ مضمون ہے۔ معلوم نہیں ہو سکا کہ کسی نے کتابی شکل میں بھی چھاپ دیا ہے؟ البتہ "مقالات احسانی" میں اس کا کچھ حصہ شامل کر لیا گیا ہے۔

(۵) بہشتی پیداواروں کی ایک جھلک: مولانا گیلانی کا یہ مضمون "دارالعلوم" دیوبند کی پانچ قسطوں (دسمبر ۱۹۵۴ء تا جون ۱۹۵۵ء) میں چھپا تھا۔ بصیرت و موعظت سے معمور اور ایمان افروز یہ مضمون ۱۹۹۷ء میں دارالفکر کراچی سے کتابچے کی شکل میں چھپ گیا ہے۔ خاکسار ابو سلمان شاہجہاں پوری نے اس پر مختصر پیش لفظ تحریر کیا ہے۔

(۶) مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کا افسانہ: مولانا گیلانی مرحوم کا یہ مقالہ فروری ۱۹۵۲ء تا جنوری ۱۹۵۳ء برہان دہلی کی بارہ قسطوں میں شائع ہوا تھا۔ تاریخی حقائق اور مذہبی معلومات سے بھرپور یہ سبق آموز سلسلۂ مضمون ندوۃ المصنفین دہلی نے کتابی شکل میں بھی چھاپ دیا تھا۔ اس کی نقل ادارہ اسلامیات لاہور نے ۱۹۷۶ء میں شائع کر دی ہے۔

(۷) مکاتیب گیلانی: وقت کے پچاسوں مشاہیر و معاصر سے مولانا گیلانی کے روابط اور مکاتبت کا تعلق تھا۔ اس کے علاوہ تلامذہ و اعزہ وغیرہ سے مکاتبت کا تعلق ہمیشہ رہا۔ ان کے ہزاروں خط ان حضرات یا ان کے خاندانوں میں اب تک ہوں گے جن کے جمع تدوین اور اشاعت کی کوئی صورت ابھی تک نہیں ہو سکی۔ مولانا کے انتقال کے بعد مولانا منت اللہ رحمانی نے خطوط کے جمع و تدوین کے لیے قدم اٹھایا تھا۔ اور ستاسی خطوط کا ایک مجموعہ شائع بھی کیا تھا لیکن یہ سعی مولانا کے تمام خطوط کی فراہمی اور ترتیب و اشاعت تک کامیاب نہ ہو سکی۔

مولانا رحمانی نے "مکاتیب گیلانی" کا جو مجموعہ "جلد اول" کے طور پر چھاپا تھا۔ اس میں اہلیہ مولوی سید محمد یعقوب وکیل (ایک خط)، حکیم حافظ یوسف حسن خاں رحمانی (ایک خط)، مولانا محمد زکریا محمودی (ایک خط)، مولوی محمد یعقوب ڈپٹی کلکٹر (چار خط)، مولانا

عبدالباری ندوی (انچاس خط)، اور مولانا سید سلیمان ندوی (اکتیس خط) کل ستاسی خطوط ہیں۔

مولانا سید سلیمان ندوی کے نام مولانا گیلانی کے خطوط معارف اعظم گڑھ میں فروری تا اگست ۱۹۶۳ء میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے مطالعہ و موازنہ سے پتا چلا کہ مجموعے کے خطوط نہایت ناقص ہیں اور تمام خطوط مجموعے میں شامل بھی نہیں۔

مولانا منت اللہ رحمانی نے "عرضِ مرتب" کے عنوان سے خطوط کی فراہمی اور ترتیب واشاعت کی روداد بیان کی ہے۔ اور "مقدمہ" مولانا عبدالباری ندوی مرحوم کے قلم سے ہے۔ اور خاصے کی چیز ہے۔ اس میں حضرت گیلانی کے ذوق و سوانح اور افکار کے کئی گوشوں میں روشنی پڑتی ہے۔ ان کے تفسیری انداز اور خصائص پر طویل بحث ہے۔ خطوط نگاری کے محاسن، ذہنی و دماغی کمالات، سیرت کے محامد بھی اجاگر ہوئے ہیں۔ یہ مقدمہ کوئی ایسا شخص ہی لکھ سکتا تھا جس نے مولانا کو قریب سے دیکھا ہو اور ایک مدت کا قرب وصحبت اسے میسر آئی ہو۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے مولانا گیلانی کے خطوط کے بارے میں لکھا تھا:

"آپ کے خطوط میں برجستگی و بے ساختگی کے ساتھ ہلکی ہلکی ظرافت اور علمی نکتہ آفرینیوں کے ساتھ لطیف طنز بھی پایا جاتا تھا۔ وہ بسا اوقات طنز کے پیرائے میں علم وفن یا شریعت و تصوف کے ایسے عجیب وغریب نکات بیان کر جاتے تھے جو تلاش کے باوجود کسی کتاب میں نہیں ملیں گے"۔

(برہان، دہلی، اگست ۱۹۵۶ء، ص ۶۸)

مکاتیب گیلانی کا یہ مجموعہ ۱۹۷۲ء میں مونگیر (بہار) سے شائع ہوا تھا۔ مولانا رحمانی مکاتیب کے جمع و تدوین کو اپنے منصوبے کے مطابق پایہ تکمیل کو نہیں پہنچا سکے۔ خدا کرے اب کوئی صاحب ہمت اس طرف متوجہ ہوں اور جس حد تک بھی اخبار و رسائل میں منتشر اور بعض خاندانوں میں محفوظ متوقع ذخیرہ خطوط فراہم ہو سکے شائع کر دیا جائے۔ مولانا کے انتقال کے بعد گذشتہ ۴۴، ۴۵ برس میں اگرچہ یہ کام مشکل ہو گیا ہے لیکن اگر اب بھی اس جانب توجہ نہ کی گئی تو فراہمی خطوط کی راہ مزید دشوار اور کامیابی کے امکانات اور معدوم ہو جائیں گے۔

(۸) ہزار سال پہلے: مسلمان سیاحوں کے سفرناموں سے ماخوذ معلومات و مشاہدات

کا جامع ایک سلسلۂ مضمون غالباً دارالعلوم دیوبند (ماہنامہ) میں نکلا تھا۔ دارالعلوم دیوبند کی انجمن ثمرۃ التربیت نے ۱۹۵۰ میں کتابی شکل میں چھاپ دیا تھا۔ کراچی سے نفیس اکیڈمی نے اسے ۱۹۶۴ء، ۱۹۷۰ء اور ۱۹۷۵ء میں تین بار شائع کیا تھا۔ میرے سامنے اس کی تیسری اشاعت ہے۔ (صفحات ۳۲۰)

شاہ معین الدین ندوی مرحوم (ف دسمبر ۱۹۷۴ء) نے اس پر تبصرے میں لکھا تھا:

"فاضل مصنف نے جن کا ہمہ گیر ذوق نئے نئے رنگ میں اپنا جلوہ دکھاتا رہتا ہے، قدیم سفرناموں اور جغرافیے کی مدد سے آج سے "ہزار سال پہلے" کے عنوان سے ایک مسلسل مضمون لکھا تھا جو غالباً رسالہ دارالعلوم میں شائع ہوا تھا۔ اس کو کتابی شکل میں شائع کر دیا گیا ہے۔ اس میں ہزار سال پہلے کے ہندوستان، چین، عراق، ایران، ترکستان، اور شمالی افریقہ کے بعض علاقوں کے مذہبی، معاشرتی، تمدنی اور علمی حالات اور دوسرے عجائب و نوادر کی جھلک دکھائی گئی ہے۔ اس لحاظ سے یہ کتاب مفید بھی ہے اور دل چسپ بھی"۔

(معارف، اعظم گڑھ، ستمبر ۱۹۵۰ء، ص ۲۳۶)

(۹) کائنات روحانی: کئی حضرات نے مولانا کے اس نام کے ایک رسالے کا ذکر کیا ہے۔ ان کی نظر سے بھی گذرا ہے لیکن اس کا نفسِ مضمون اور اس کی تفصیل کسی نے بیان نہیں کی۔ میری نظر سے یہ رسالہ نہیں گزرا۔

(۱۰) السائل و عواقبہ (بھیک مانگنے والوں کا انجام): مولانا مرحوم کا یہ مضمون الرشید (دیوبند) میں ذی قعدہ و ذی الحجہ ۱۳۳۴ھ اور صفر ۱۳۳۵ھ کی تین قسطوں میں چھپا تھا۔ ہندوستان سے اسے کتابچے کی شکل میں چھاپ دیا گیا ہے۔ اب کراچی کا ایک ادارہ دارالفکر اسے چھاپ رہا ہے۔

(۱۱) کائنات روحانی: اس ظاہری کائنات کی طرح ایک روحانی کائنات ہے اور اس کا ایک باقاعدہ نظام ہے۔ مولانا نے اس کی تشریح میں القاسم (دیوبند) میں ایک مضمون لکھا تھا۔ اسے کسی نے ہندوستان میں چھاپ دیا ہے۔ یہ رسالہ میری نظر سے نہیں گزرا ہے۔ پروفیسر اختر راہی نے اس رسالے کا ذکر کیا ہے۔ تفصیل نہیں لکھی۔ (المعارف، لاہور، ستمبر ۱۹۸۰ء)

غیر مرتب مقالات ومضامین

مولانا گیلانی علیہ الرحمہ کی تصنیفات وتالیفات کا ذکر ہو چکا ہے اور ان کے ضمن میں مولانا کے بہت سے مضامین ومقالات قارئین محترم کی نظروں سے گذر چکے ہیں۔ لیکن جیسا کہ ذکر کیا گیا ان کے علمی مقالات ومضامین کا بہت بڑا ذخیرہ ہے، جو رسائل وجرائد کے صفحات میں چھپا ہوا ہے۔ ابھی تک نہ کسی نے اس کی جستجو کی اور نہ اس کی ترتیب وتدوین کا کوئی قدم اٹھایا گیا۔

مولانا کی تصنیفات وتالیفات کے جو کام اب تک انجام پائے ہیں ان میں علمی ذوق اور حضرت مولانا کے افادات وتحقیقات کی تدوین واشاعت کے بے لوث جذبے کے بجائے اداروں اور افراد کے اغراض ومقاصد اور کاروبار کی ضرورتوں کو زیادہ دخل رہا ہے۔ یہ بات میں طنزاً نہیں کہہ رہا ہوں۔ کاروبار کوئی بری چیز تو نہیں اور یہی کاروبار جو انسانی زندگی کے قیام وبقا کے لیے ضروری ہے۔ لیکن علم وتحقیق کی خدمت خالص علمی ذوق سے انجام دینا اور اپنی ضروریات زندگی کی فراہمی کا اسے وسیلہ بنانا، دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ علم وتحقیق کے کاموں کو علمی خدمت کے ذوق وجذبے سے انجام دیا جائے تب بھی اس سے دنیاوی فائدہ حاصل ہو سکتا ہے۔ پھر علمی خدمت کی پاکیزگی کو دنیاوی اغراض سے کیوں داغ دار کیا جائے؟ بہر حال ضرورت اس چیز کی ہے کہ حضرت گیلانی کے افادات کو فراہم کر کے انھیں مختلف مجلدات میں مرتب ومدون کر کے شائع کیا جائے۔ اور خدا توفیق دے تو خالص علمی ذوق وجذبۂ خدمت سے یہ کام انجام دیا جائے۔ دنیاوی فوائد جن کے لیے کتنے ہی نیک جذبات کو تباہ کر دیا جاتا ہے وہ ہر حال میں اس سے حاصل ہوں گے۔

ذیل میں مولانا مرحوم کے افادات علمیہ جو مضامین ومقالات کے مجلدات کی صورت میں ابھی تک مرتب ومدون نہیں کیے جا سکے ہیں۔ ضروری ہے کہ ان کی ایک فہرست مرتب کر دی جائے۔ اس سلسلے میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ انھیں مختلف موضوعات کے ذیل میں مرتب کیا جائے۔ لیکن یہ تقسیم وترتیب قطعی نہیں ہے۔ مولانا کے بیشتر مضامین اپنی مختلف خصوصیات کی بنا پر کئی موضوعات کے تحت رکھے جا سکتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس کے بعد بھی مولانا کے بہت سے مضامین تک جستجو کے قدم پہنچ ہی نہیں سکے

ہیں۔ اس لیے کہ مولانا کے رشحات علم وفکر پچاسوں اخبار اور رسائل وجرائد میں چھپے اور مکمل فائلیں اہم جرائد ورسائل کی بھی دستیاب نہیں، لیکن پھر بھی بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے۔ کہ جہاں تک جستجو وتحقیق کے قدم پہنچ چکے ہیں یہ بھی کچھ کم کامیابی نہیں۔ اب آپ مولانا گیلانی مرحوم کے مضامین کی فہرست ملاحظہ فرمایئے۔

تاریخ وسیاسیات

☆ ان دیکھی قوت ایک پوشیدہ خزانہ (ہندوستان میں مسلمانوں کی باعزت زندگی کا مسئلہ)	الفرقان لکھنؤ۔ ذیقعدہ ۱۳۶۴ھ
☆ انسانی تاریخ کی ایک مثالی حکومت (عمر بن عبدالعزیز کی حکومت)	معارف اعظم گڑھ۔ مارچ ۱۹۵۰ء
☆ پاکستان کا اسلامی دستور	صدق لکھنؤ ۱۹۴۸ء
☆ پاکستان اور ہندوستان ایک نئے نقطہ نظر سے	ایضاً
☆ تاتاریت اور فرنگیت میں مماثلت	ایضاً نومبر تا دسمبر ۱۹۴۶
☆ تاریخ اندلس سے سبق	ایضاً ۲۸/جولائی ۱۹۵۰ء
☆ مسلمانوں کا اندلس خود ان کی نگاہ میں (دو قسطوں میں)	معارف اعظم گڑھ، نومبر، دسمبر ۱۹۵۳ء
☆ تاریخ چین کا ایک ورق	برہان، دہلی، اگست ۱۹۵۶ء
☆ جماعت مودودی اور جمہوریت	صدق، لکھنؤ ۸/اگست ۱۹۵۰ء
☆ دلی اور مابعد	ایضاً ۲۱/نومبر ۱۹۴۷ء
☆ قیصریت اور کسرویت	ایضاً جون ۱۹۴۸ء
☆ کرشن کے ساتھ آریوں کی عداوت پر ایک نظر	القاسم، دیوبند، شعبان ۱۳۳۵ھ
☆ مسلمانوں کی حکومت میں غیر مسلم اقوام (چار قسطوں میں)	معارف اعظم گڑھ جون نومبر ۱۹۵۰ء جنوری وفروری ۱۹۵۱ء
☆ مسلم عہد حکومت میں	صدق، لکھنؤ، ۱۶/جون ۱۹۵۱ء
☆ مسلم خروج حکومت میں.....	صدق جدید، لکھنؤ فروری ۱۹۵۵ء

☆ اسلامی حکمرانوں سے مسلمانوں کی ایک بے جاشکایت (پانچویں قسط)	معارف اعظم گڑھ، اگست تا دسمبر ۱۹۴۸ء
☆ مسئلہ ہجرت کا علمی جائزہ (۱۹۴۷ء کے بعد ہندوستان سے ترک وطن کا مسئلہ)	صدق لکھنؤ، مارچ تا اپریل ۱۹۴۹ء
☆ وقت کی اہم پکار	ایضاً ۳/مارچ ۱۹۵۰ء
☆ ہندوستان کی ایک قدیم پنج سالہ اسکیم (عہد شیر شاہ سوری میں رفاہ عامہ کے کام)	الفرقان لکھنؤ، جمادی الاخری ۱۳۷۴ھ
☆ ہندوستانی مسلمانوں کے متعلق چند مشورے اور تجویزیں	الفرقان، شوال ۱۳۶۴ھ

تراجم وادبیات

☆ جبر السیٔات بالحسنات، از محمد بن علی الحاتی بن عربی،	الرشید دیوبند ذیقعدہ ۱۳۳۵ھ
☆ الریاضۃ الجسمانیہ از حافظ ابن قیم	ایضاً
☆ عمر الدنیا از علامہ شہاب محمود	ایضاً
☆ میرے خواب از علامہ عبدالوہاب شعرانی	ایضاً
☆ عورتوں کی بیعت، از علامہ شہاب محمود	ایضاً جمادی الاخری ۱۳۳۵ھ
☆ تذکرۂ اعظم (تبصرہ)	القاسم، دیوبند، رمضان، شوال ۱۳۳۵ھ
☆ دیوان العرب یا حماسہ	الرشید، دیوبند جمادی الاولیٰ ۱۳۳۵ھ
☆ مراقبات (از ڈاکٹر میر ولی الدین) (تبصرہ)	معارف، اعظم گڑھ، جنوری ۱۹۴۹ء
☆ حکیم الامت (از مولانا عبدالماجد دریابادی) (تبصرہ)	ایضاً اکتوبر ۱۹۵۲ء

سوانح وشخصیات

☆ اسلامی رواداری اور مساوات کا ایک دلاویز مرقع	الفرقان، لکھنؤ، رجب ۱۳۷۴ھ
☆ ایک اسمٰعیلی دین دار (احمد نواز جنگ)	صدق جدید، لکھنؤ، ۴/فروری ۱۹۵۵ء
☆ ایک تعزیت نامہ	ایضاً ۱۶/نومبر ۱۹۵۱ء
☆ ایک درویش اپنے آخری وقت میں	الفرقان، لکھنوی، مئی جون ۱۹۷۵ء

☆ ایک سیاسی قوال کا عبرتناک عروج وزوال (تیسری اور آخری قسط)	الفرقان، لکھنؤ جمادی الاولیٰ ۱۳۷۴ھ
☆ تقریر تعزیت (بروفات حضرت تھانوی)	صدق، لکھنؤ، ۲۳/اگست ۱۹۴۳ء
☆ تعزیت نامہ (بروفات مولانا محمد علی)	سچ، لکھنؤ ۱۶/جنوری ۱۹۳۱ء
☆ حبیب الرحمن خاں شروانی	معارف، اعظم گڑھ، دسمبر ۱۹۵۰ء
☆ دنیا کے دو بھائی اور دین کے دو بھائی	سچ، لکھنؤ مارچ ۱۹۳۱ء
☆ سر علی امام	صدق جدید، لکھنؤ، ۲۸/جولائی ۱۹۶۱ء
☆ مرزا رحیم بیگ محمد درویش عظیم آبادی شہید	برہان، دہلی۔ اگست ۱۹۵۸ء
☆ شہادت حسنی	سچ، لکھنؤ، اگست ۱۹۲۶ء
☆ ایضاً	صدق، لکھنؤ ۱۶، ۲۳/نومبر ۱۹۴۲ء
☆ منصور حلاج	سچ، لکھنؤ اپریل ۱۹۴۲ء
☆ مولانا سید برکات احمد ٹونکیؒ	معارف، اعظم گڑھ، مارچ، اپریل ۱۹۲۹ء
☆ واقعہ حضرت زینب	القاسم (دیوبند) جمادی الاخری رجب ۱۳۳۵
☆ وفاداری کے دو نادر نمونے (حجاج بن یوسف کی عبدالملک اور ولید سے ابراہیم تیمی کی ابراہیم نخعی سے وفاداری کے حیرت انگیز واقعات)	الفرقان، لکھنؤ، ۱۳۷۲ھ
☆ ہمارے سپہ سالار	سچ، لکھنؤ، ۲۳/مارچ ۱۹۴۳ء
☆ ہندوستان کا ایک مظلوم مولوی (عہد اکبری کا شیخ قطب) (تین قسطیں)	معارف اعظم گڑھ، اکتوبر، نومبر ۱۹۵۱ء وجنوری ۱۹۵۲ء

مذہب واخلاقیات

☆ اسلاف سے فائدہ اٹھانے کا جدید طریقہ	الرشید، دیوبند، جمادی الاخری رجب ۱۳۳۵ھ
☆ اسلام اور سود (مقدمہ کتاب ڈاکٹر انور اقبال قریشی)	سچ، لکھنؤ، اکتوبر ۱۹۴۵ء
☆ اسلام کا جشن یوم تاسیس	صدق، لکھنؤ ۲۶/اکتوبر ۱۹۴۶ء

☆ اسلامی سزائیں	صدق جدید، لکھنؤ ۴؍دسمبر ۱۹۵۳ء
☆ ایام جاہلیت کا جاہلیت حاضرہ سے موازنہ	سچ، لکھنؤ، ۱۴، ۳۱؍جولائی و ۴؍اگست ۱۹۳۳ء
☆ ماہ جنون پرور یا شہر رمضان	سچ، لکھنؤ، جنوری ۱۹۴۶ء
☆ بقر عید یا عملی اسلام کا پہلا دن	الفرقان، لکھنؤ، رمضان، شوال ۱۳۶۱ھ
☆ تقلید و اقتدا	سچ، لکھنؤ، ۷، ۱۴ و ۲۱؍اگست ۱۹۳۱ء
☆ تکفیر و تفریق پر ایک نظر	صدق، لکھنؤ، جولائی ۱۹۴۳ء
☆ جاہلیت قدیم و جدید	سچ، لکھنؤ، ۱۸؍نومبر ۱۹۲۷ء
☆ جدید تمدن کا ماتم	القاسم، دیوبند، شوال ۱۳۴۴ھ
☆ جدید علم کلام قدیم زبان میں	معارف، اعظم گڑھ جولائی و دسمبر ۱۹۳۵ء
☆ تاریخ ارض القرآن (تبصرہ)	معارف اعظم گڑھ، مئی ۱۹۵۵ء
☆ چاند کے بارے میں ریڈیو کی خبر	الفرقان، لکھنؤ، رمضان و شوال ۱۳۸۳ھ
☆ حج کیا ہے؟	ایضاً حج نمبر ۱۳۶۸ھ
☆ راہ کعبہ کے احساسات و واردات	ایضاً ۱۳۶۹ھ
☆ دربار نبوت کی حاضری	ایضاً ۱۳۷۰ھ
☆ اللہ کے گھر پہنچ کر	ایضاً ۱۳۷۱ھ

☆ خصائل الفطرۃ	الرشید۔ دیوبند۔ محرم ۱۳۳۵ھ
☆ ایضاً	ایضاً رجب ۱۳۳۵ھ
☆ خطبہ جمعہ کی زبان	برہان۔ دہلی، مارچ ۱۹۴۷ء
☆ دامغات الاغلوطات کا سر شکن)	القاسم۔ دیوبند۔ ربیع الثانی ۱۳۳۴ھ
☆ ایضاً (متعدد قسطوں میں، آخری قسط)	
☆ دور فتن	سچ، لکھنؤ ۱۴؍فروری ۱۴ و ۲۱؍مارچ ۱۹۲۷ء بعدہ
☆ روشن خیالی یا حماقت	الفرقان، لکھنؤ، ۱۹۷۴ء

☆ سکرۃ الموت	صدق جدید، لکھنؤ، ۱۲ و ۱۹ ستمبر ۱۹۵۲ء
☆ قربانی کا فلسفہ	صدق، لکھنؤ، دسمبر ۱۹۴۳ء
☆ مذہب کی ضرورت	القاسم، (دیوبند، ذی الحجہ ۱۳۳۵ھ
☆ مسلمانوں کے دنیوی مصائب کے دینی اسباب	برہان، دہلی، جنوری ۱۹۴۹ء
☆ مسئلہ تناسخ پر ایک تاریخی نظر	القاسم۔ دیوبند ربیع الاول، جمادی الاولیٰ ۱۳۳۵ھ
☆ مسئلہ رویت ہلال	صدق جدید، لکھنؤ، ۲۳؍نومبر ۱۹۵۱ء
☆ مسئلہ سود۔ مسلم و حربی میں (چار قسط)	معارف، اعظم گڑھ نومبر ۴۵ تا دسمبر ۱۹۴۶ء
☆ مسئلہ سود و قرض کی مزید تشریح	سچ، لکھنؤ جنوری ۱۹۴۵ء
☆ مولانا عثمانی اور فضل اللہ کی خدمت میں	معارف، اعظم گڑھ، ستمبر ۱۹۵۳ء
☆ نام، کنیت، لقب پر اسلامی تعلیمات کا اثر	الرشید، دیوبند، جمادی الاخریٰ و رجب ۱۳۳۵ھ
☆ نصرانی تہمتیں	سچ، لکھنؤ اکتوبر، ۱۹۴۵ء
☆ واہمہ کا شوشہ اور دولت کا نشہ	دار العلوم دیوبند، جولائی ۱۹۵۶ء
☆ ہادم اللذات یعنی موت	الفرقان، لکھنؤ ذی الحجہ ۷۱ و صفر ۷۲ ۱۳ھ
☆ یادگار گیلانی	الفرقان، لکھنؤ ذی الحجہ ۷۵ ۱۳ھ

متفرقات

☆ حجازی عربی کا سامی زبانوں	برہان، دہلی، مئی ۱۹۴۴ء
☆ آج کی مشکلات کا حل کل کے آئینے میں	صدق، لکھنؤ ۱۱ و ۱۸ مئی ۱۹۴۲ء
☆ اسلامی صحافت کی تنظیم	صدق، لکھنؤ، نومبر ۱۹۴۶ء
☆ تاثیر الادویہ	الرشید۔ دیوبند، محرم ۱۳۳۵ھ
☆ حل مشکلات کی زندہ تدبیریں	سچ، لکھنؤ، اکتوبر ۱۹۳۱ء
☆ خوارق عادت کے وقوع پر یورپ کی بعض شہادتیں	القاسم، دیوبند، ذی الحجہ ۱۳۳۵ھ
☆ فلسفہ ارتقاء پر ایک نظر—ایک نئے پہلو سے	صدق۔ لکھنؤ، ۱۹؍اپریل ۱۹۴۳ء
☆ مسئلہ جذب و کشش پر ایک تنقیدی نظر	القاسم، دیوبند، جمادی الاخریٰ ۱۳۳۵ھ
☆ قاسم العلوم اور اس کا لائحہ عمل	القاسم، دیوبند شعبان ۱۳۵۳ھ

باب ششم

طرز تحریر و نگارش

حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ کی متعدد تصانیف اور بہت سی تحریرات ہمارے سامنے ہیں جن کا دائرۂ بحث و نظر مختلف علوم و فنون تک پھیلا ہوا ہے۔ ان کا علم و فن کی دنیا میں کیا مقام ہے؟ یہ بحث تو اہل علم اور اصحاب فن کی توجہ کی محتاج ہوگی۔ لیکن اس سے پہلے کہ کوئی محترم قاری ان کے علمی و فنی خصائص کی طرف توجہ فرمائیں جو چیز توجہ کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے اور تحریر و کتاب کے خاتمے تک اسے اپنی گرفت سے آزاد نہیں کرتی، وہ ان کے قلب کا گداز اور جان کا سوز ہے۔ جو حروف و الفاظ اور سواد تحریر میں روح تاثیر کی طرح جاری و ساری ہوتا ہے۔

حضرت گیلانی کی تحریر کی دوسری خوبی ان کی بات سے بات پیدا کرنے کا سلیقہ ہے۔ وہ ایک بات شروع کرتے ہیں اور پھر بات سے بات پیدا کرتے ہوئے آغاز کلام کے مقام سے بہت دور نکل جاتے ہیں۔ لیکن وہ کتنے ہی دور چلے جائیں تحریر کا فکری ربط کہیں نہیں ٹوٹتا، معنویت کہیں مجروح نہیں ہوتی اور قاری کو نقطۂ آغاز بحث سے بُعد مسافت کا احساس نہیں ہوتا۔ اس کی دلچسپی برقرار اور گل افشانی تحریر اور رنگینی بیان میں اس کی محویت قائم رہتی ہے۔ ان کے جملہ ہائے معترضہ جملوں کے حدود میں نہیں رہتے، مفصل عبارتوں تک اور ضمنی مباحث ضمنی نہیں رہتے، مستقل بحثوں، فصلوں اور ابواب تک پھیل جاتے ہیں۔ اس طرح ان کی ایک فن میں کتاب مختلف علوم و فنون کا خزینہ اور افکار کا گنجینہ بن جاتی ہے۔ اور بعض اوقات فن کا سر رشتہ قاری کے ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے۔ اور اسے ٹھہر ٹھہر کر سوچنا پڑتا ہے کہ شاہ راہ فن سے الگ ہو کر معترضات اور ضمنیات کی پگڈنڈی پر کہاں سے پڑے تھے، اور اب کس مقام پر ہیں، لیکن قاری کی حیرت دور نہیں ہونے پاتی کہ شاہ راہِ فن اس کے سامنے پھر نمودار ہو جاتی ہے اور وہ اس راہ پر چل پڑتا ہے۔ خواہ وہ زیادہ دیر اور بہت دور تک اس پر نہ چل سکے اور پھر کسی ضمنی اور ذیلی بحث میں الجھ کر شاہ راہِ فن سے دور جا پڑے اور سر رشتہ فکر اس کے ہاتھ سے چھوٹ جائے۔ لیکن ان کی تحریر کی اس خوبی کو کیا کہیے گا کہ قاری کی اس سے

دلچسپی ایک لمحے کے لیے کم نہیں ہوتی۔ وہ پیراہن تحریر کی تراش خراش کے حسن و قبح کے بجائے اس کی رنگینیوں میں کھو جاتا ہے۔

مولانا کی تحریر پہلی نظر میں بڑی پیچیدہ اور مشکل نظر آتی ہے۔ لیکن جوں جوں مطالعے کی نظر ٹھہرتی ہے اور ذوق موضوع سے آشنا ہوتا ہے۔ مشکلات کی دھند چھٹتی جاتی ہے۔ اور تحریر کا حسن اور نگارش کی خوبیاں نمایاں ہونے لگتی ہیں۔ مولانا کی تحریروں سے لطف اندوز ہونے کے لیے ہمیں سب سے پہلے موضوع تحریر اور اسکے فن سے ذوق کو آشنا بنانے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اگر ایسا ہو تو تحریر کی پے چیدگیاں خود بہ خود دور ہوتی چلی جاتی ہیں۔ اور قاری کی دل چسپی اس حد تک بڑھ جاتی ہے۔ کہ وہ ان کے طلسم زادِ تحریر میں کھو جاتا ہے۔ ممکن ہے آغاز مطالعہ میں کسی محترم قاری کو ان کے جملہ ہائے معترضہ کی کثرت اور تحریر کی پیچیدگی سے پریشانی ہو اور قدرے بے کیفی محسوس ہو اور ایک دو صفحوں تک یہ کیفیت برقرار رہے۔ لیکن جہاں دو چار جام چڑھائے اور حلق اشربۂ تحریر کی تلخی سے آشنا ہوئی، دماغ پر ایسا سرور طاری ہوتا ہے کہ بے کیفی کا تمام احساس دور ہو جاتا ہے۔ اور قاری اس کی رنگینیوں میں کھو جاتا ہے۔ تحریر کا حسن، اس کی روانی اور سواد حروف و تحریر سے اٹھنے والی سوز و گداز کی لہریں اور اس کی تاثیر قاری کے دل کو مسحور کر دیتی ہیں۔

ان کی تحریر و نگارش کی ایک خوبی ان کا فلسفیانہ طرز کلام اور طرز استدلال تھا۔ فلسفہ و حکمت کی تحصیل میں انھوں نے اپنی طالب علمانہ زندگی کے کئی برس صرف کیے تھے۔ اسے انھوں نے سبقاً سبقاً بہ طور علم پڑھا تھا۔ اس کے علم، اصول و کلیات، تاریخ وار تقاء اور اس کے انحراف پر ان کی نظر گہری ہو گئی تھی۔ اس کا ذوق ان کے ذہن میں رچ بس گیا تھا۔ اگرچہ انھوں نے بہ طور علم اسے اپنی کسی تصنیف کا موضوع نہیں بنایا البتہ اپنی تصنیفات اور مضامین میں اسلامی تعلیمات اور عقائد و مسائل کی تفہیم میں اس سے بہت کام لیا ہے۔ تعلیمی زندگی کے تو صرف چند برس انھوں نے فلسفہ و حکمت کے مطالعہ و تحصیل میں گزارے تھے لیکن اس کی چھاپ ہمیشہ کے لیے ان کے اندازِ فکر پر لگ گئی جو خاص مسائل و مباحث پر نگارشات ہی میں نہیں، بلکہ ہمہ قسم کی تحریروں میں صاف محسوس کرلی جاسکتی ہے۔ اس سے انھوں نے مسائل و مطالب کی تفہیم میں طرز استدلال ہی کا کام نہیں لیا، بلکہ طرز تحریر و نگارش میں تزئین کا کام بھی لیا ہے۔ اس طرح حکیمانہ طرز استدلال اور فلسفیانہ طرز کلام ان کی تحریر کی

ایک بڑی خوبی بن گئی ہے۔

مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے انھیں ذہن رسا اور طبیعت بہت اخاذ و نکتہ آفریں عطا فرمائی تھی۔ جب وہ کسی موضوع پر قلم اٹھاتے تو ان کے سامنے معلومات کا انبار اور ذہن میں افکار و خیالات کا ہجوم ہوتا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا کہ مقالہ وتصنیف کے مضامین و مطالب ابواب و فصول میں تقسیم و ترتیب سے بے نیاز ہو جاتے اور جیسا کہ ان کی عادت معلوم ہے کہ اپنی کسی تحریر پر نظر ثانی کی زحمت گوارا نہ فرماتے تھے۔ اس طرح ان کی تحریرات میں ایک طرح کی بے ترتیبی پائی جاتی ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ بہتر ہی ہوتا تھا کہ وہ اپنی تحریروں پر اصلاح و ترمیم اور نظر ثانی کا قلم نہ اٹھاتے تھے یا تزئین و آرائش تحریر کا انھیں موقع نہ ملتا تھا۔ اس لیے کہ ان کے علم اور مطالعے، افکار کے تنوع، خیالات کی بلندی، ذہن کی نکتہ آفرینی، دماغ کی زرخیزی اور طبیعت کے اخذ و اکتساب کی بے پناہ صلاحیتوں کا جو عالم تھا اگر اس میں وہ تبویب و ترتیب جدید، ترمیم و اصلاح مضامین اور تزئین و آرائش تحریر کا قلم ہاتھ میں لیتے تو ترمیم و تنسیخ، حک و اضافہ، تزئین و آرائش جمال کی کوشش میں تحریر کی پہلی شکل بھی بگڑ جاتی اور پہلی کی جگہ اُسی مصنف کے قلم سے اُسی قسم کی ایک نئی نگارش وجود میں آجاتی۔ لیکن اس بات کی کیا ضمانت ہوتی کہ نظر ثانی و اصلاح شدہ تحریر ہمارے ذوق کے مطابق بھی ہوتی اور پھر وہ تحریر بھی اصلاح و نظر ثانی کی مستحق کیوں نہ ٹھہرتی اور اس پر بھی تزئین و آرائش کا عمل کیوں نہ کیا جاتا؟ لیکن کیا یہ ممکن ہوتا؟ میرا خیال ہے کہ ایسا ہرگز ممکن نہ ہوتا۔ پس ایسی صورت میں تو نظر ثانی کا ترک ہی اولیٰ تھا۔ اور مولانا گیلانی کی تحریرات کا نقشِ اوّل ہی اس کا نقش جمیل قرار پاتا ہے۔

ان کے قلم سے مضامین اس طرح نکلتے تھے جیسے آسمان سے بارش ہوتی ہے یا کوئی چشمہ پھوٹ پڑتا ہے اور اسکا پانی روکے نہیں رکتا، جس طرف بہہ نکلتا ہے بہتا ہی چلا جاتا ہے۔ اس کا بہاؤ اور اسکی تیزی اپنی سمت خود متعین کرتی ہے۔ وہ ہماری بنائی ہوئی مصنوعی نالیوں اور ہمارے بنائے ہوئے بہاؤ کے راستوں کی پابند نہیں ہوتی۔

بلا شبہ مبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کے دماغ پر افکار کی موسلا دھار بارش اور قلب پر افکار کا نزول زبان کی حرکت اور قلم کی جنبش سے زیادہ تیزی سے ہوتا تھا۔ ان کی تحریر کا

ہر جملہ فکر انگیز و خیال آفریں ہوتا ہے۔ ایک خیال دوسرے سے اور دوسرا تیسرے سے وابستہ و پیوستہ ہوتا تھا۔ یہ ربط بحث و نظر کی کسی خاص حد تک نہیں بلکہ پورے مقالے میں ہوتا تھا۔ ان کی تحریر افکار و خیالات کا تیز رو دریا ہوتا تھا جو امنڈتا چڑھتا، بڑھتا اور ہر خشک و تر سے گزرتا اور ہر نشیب و فراز پر چھاتا چلا جاتا تھا۔ اور اتنی تیزی اور تندی کے ساتھ کہ قاری کے خیالات و جذبات کو بھی خس و خاشاک کی طرح اپنے ساتھ بہالے جاتا ہے اور اسے سوچنے اور سنبھلنے کا بھی موقع نہیں دیتا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریریں ہمارے بنائے ہوئے اصول و قواعد کے مطابق ابواب و فصول میں تقسیم سے بے نیاز ہوتی ہیں اور کسی مرتب و مدون کے لیے سخت مشکل پیش آتی ہے کہ ان کی کسی تحریر کو ابواب و فصول کی قید میں لائے۔ زیادہ سے زیادہ جو اہتمام کیا جاسکتا ہے، اور بعض حضرات نے کیا بھی ہے یہ تھا کہ ان کی تحریر کے مباحث کے عنوانات مقرر کر دیے جائیں۔

مولانا گیلانی رحمۃ اللہ نے شذرات اور مختصر مقالات سے لیکر متوسط اور مطول تک ہر طرح کی تصنیفات یادگار چھوڑی ہیں۔ ان کے مختصر مقالات بے شمار ہیں۔ ان کے بعض مقالات بھی سو سو صفحات یا اس سے بڑھ کر متوسط تصانیف کی حد تک پہنچ گئے ہیں۔ ان کی کئی متوسط تصانیف دراصل ان کے مقالے ہی تھے جو ان کی تصانیف میں شمار ہوئے ان کے متوسطات میں "الدین القیم"، "النبی الخاتم" "تذکرہ شاہ ولی اللہ" اور "ہزار سال پہلے" ہیں۔ مطولات میں "سوانح قاسمی" اور "ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت" ہیں۔ "امام ابو حنیفہ کی سیاسی زندگی" متوسط اور مطول کے درمیان کی کڑی ہے۔ آپ چاہیں تو اسے متوسطات میں اور چاہیں تو مطولات میں شامل کرلیں۔

ان کی کسی متوسط اور مطول کے بارے میں یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ انھوں نے اس کا پہلے خاکہ بنا کر سامنے رکھ لیا تھا، جب اس خاکے میں رنگ بھر گیا تو انھوں نے برش اٹھا کر الگ رکھ دیا کہ لو! یہ تصنیف تیار ہو گئی۔ ایسا بھی نہیں ہوا کہ کسی مقام پر ان کے معلومات کا خزانہ ختم ہو گیا ہو۔ ان کے افکار و خیالات نے اپنی کم مائیگی و بے بضاعتی کا اعلان کر دیا ہو۔ ان کا قلم چلنے سے عاجز آگیا ہو اور انھوں نے تحریر و نگارش سے ہاتھ کھینچ لیا ہو۔ ان کے معلومات کی فراوانی، افکار کی جولانی، خیالات کا جوش، قلم کی روانی ان کے ہر مختصر و مطول میں آغاز سے اختتام تک برقرار رہتی ہے۔ وہ قلم کو روکتے ہیں تو کسی رسالے کے صفحات میں گنجایش کی کمی،

کسی ناگزیر مصروفیت یا بعض اوقات بیماری یا کسی خاص عذر کی بنا پر روکتے ہیں اور کئی برس کے وقفے کے بعد جب مانع دور ہو جاتا ہے۔ تو پھر وہی چل مرے خامہ بسم اللہ کہہ کر تگاپو شروع کر دیتے ہیں۔ لیکن ان کے مختصرات ہوں، خواہ مطولات معلومات کا خزانہ، افکار کا گنجینہ، رنگا رنگ خیالات کا آئینہ خانہ اور تحریر و نگارش کے حسن و دل ربائی کا گلدستہ ہوتے ہیں۔

حرف آخر

مولانا گیلانی اپنے علم و فضل کی جامعیت، تصنیفات و تالیفات اور مضامین و مقالات کی کثرت، موضوعات کے تنوع، تحریر و نگارش کے محاسن اور کارہائے ارشاد و تعلیم اور اصلاح و تبلیغ کی وسعت کے اعتبار سے ایک شخص کہاں تھے کہ ایک سوانحی مضمون میں ان کے تعارف کا حق ادا کیا جا سکے۔ وہ ایک ادارہ اور ایک انجمن تھے۔ وہ ایک جامع جہات، جامع صفات اور ایک قاموسی شخصیت تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں ذہن و دماغ کی بہترین صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ علم و فضل کے محاسن سے ان کے وجود کو آراستہ و پیراستہ کیا تھا۔ اخلاق و سیرت کی خوبیوں سے ان کی شخصیت کو زینت دی تھی۔ نطق و بیان کے کمال اور خطابت کے جوہر سے انھیں محبوبیت کا مقام عطا فرمایا تھا۔ تحریر و نگارش اور تصنیف و تالیف کی بہترین صلاحیتیں انھیں ودیعت فرمائی تھیں اور ان کے ذریعے علوم و فنون اور مسلمانوں کی خدمت کی توفیق ارزانی فرمائی تھی۔ ان میں خیالات کو متاثر کرنے اور اپنی شیریں بیانی سے لوگوں کے دلوں میں اتر جانے کی خوبی ایک انعام خداوندی تھی۔ ان کی شخصیت انسانی خوبیوں کا حسین مرقع تھی۔ ان کے تذکرہ و تعارف کے لیے ایک مضمون اور ایک کتاب تو کیا ایک دفتر درکار ہوگا۔

اللہ تعالیٰ آخرت میں انھیں مقامات بلند عطا فرمائے۔

باب ہفتم

خراج عقیدت

صاحب ”کہف الایمان“
حضرت مولانا مناظر احسن صاحب گیلانیؒ کی وفات پر

از

(جناب کاشف راجپوری)

اس عالمِ تصویر کا انداز غضب ہے   پر جوش و بلاگیر و ہم آہنگ و پر اسرار
اس پھول کا انجام یہاں رنگِ خزاں ہے   جس سے صفتِ مہر ہے پیشانیٔ گل زار
وہ موج چھلکتی ہے ہر آن سراپا   جس موج سے اک بوند بنی گوہر شہوار
وہ بادِ صبا جس پہ بپا حشر گلستاں   وہ بادِ صبا گردشِ پیہم سے گراں بار
وہ قطرہ کہ سیرابیٔ دہقان سراپا   ہے قطع مقاماتِ منازل اسے دشوار

ہر آن ہر اک چیز یہاں گرمِ سفر ہے
ہے باعثِ تجدید یہاں لذتِ کردار

اس انفس و آفاق میں اک جلوۂ موجود   ہر شے میں برابر کبھی پیدا کبھی پنہاں
یہ منزلِ کردار نہ پستی نہ بلندی   ہے کاہش پیہم یہاں آسودگیٔ جاں
اس منزلِ تجدید میں ’ہستی‘ متغیر   گاہے ہمہ بدمستی گاہے ہمہ عرفاں
شاہی قدم فقر پہ جھکتی ہے برابر   ماضی کا اشارہ ہے ہر اک آیتِ امکاں

اس قید سے وہ نقش مبرا ہے کہ جس میں
نقاش نے مستور کیا ولولۂ جاں

آئینِ فنا عشق سے ہے لرزہ براندام   وہ عشق کہ ہے عالم تدبیر سے بالا
موجوں کی کشاکش میں وہ گوہر ہے ضیاتاب   جس کو نگہ خاورِ زرتاب نے تاکا
ہر چیز گذرتی ہے یہاں جہد بقا سے   اک عشق کی دنیا ہے کہ امروز نہ فردا

جو عشق کہ مضراب سے پیدا ہو بصد ناز
مٹ جانے سے بلبل کے وہ نغمہ نہیں مٹتا
جس معجزۂ عشق میں ہے دل کی نبوت
وہ معجزۂ عشق ابد تک خرد افزا
آنکھ اس کے نظارہ کا تحمل نہیں کرتی
جس جلوۂ اعجاز پہ ہے عشق کا پردہ

وہ مردِ مجاہد کہ جسے عشق ہے حاصل
اس مرد مجاہد کا مکاں اور زماں اور
وہ سیل گراں گیر ٹھہرتا نہیں اک دم
پستی سے گزرتا ہے تو ہوتا ہے رواں اور
وہ ذات کہ ہے عالم تعبیر سے اونچی
اس کے لیے آئین بہار اور خزاں اور
وہ گوہر زرتاب کہ دریا جسے پالے
درکار ہے اس کے لیے زینت کا جہاں اور
اس برق جہاں تاب و جہاں سوز کا عالم
چھپتا ہے نگاہوں سے تو ہوتا ہے عیاں اور
